Sharjeel Ahmed

تعلیم و تربیت

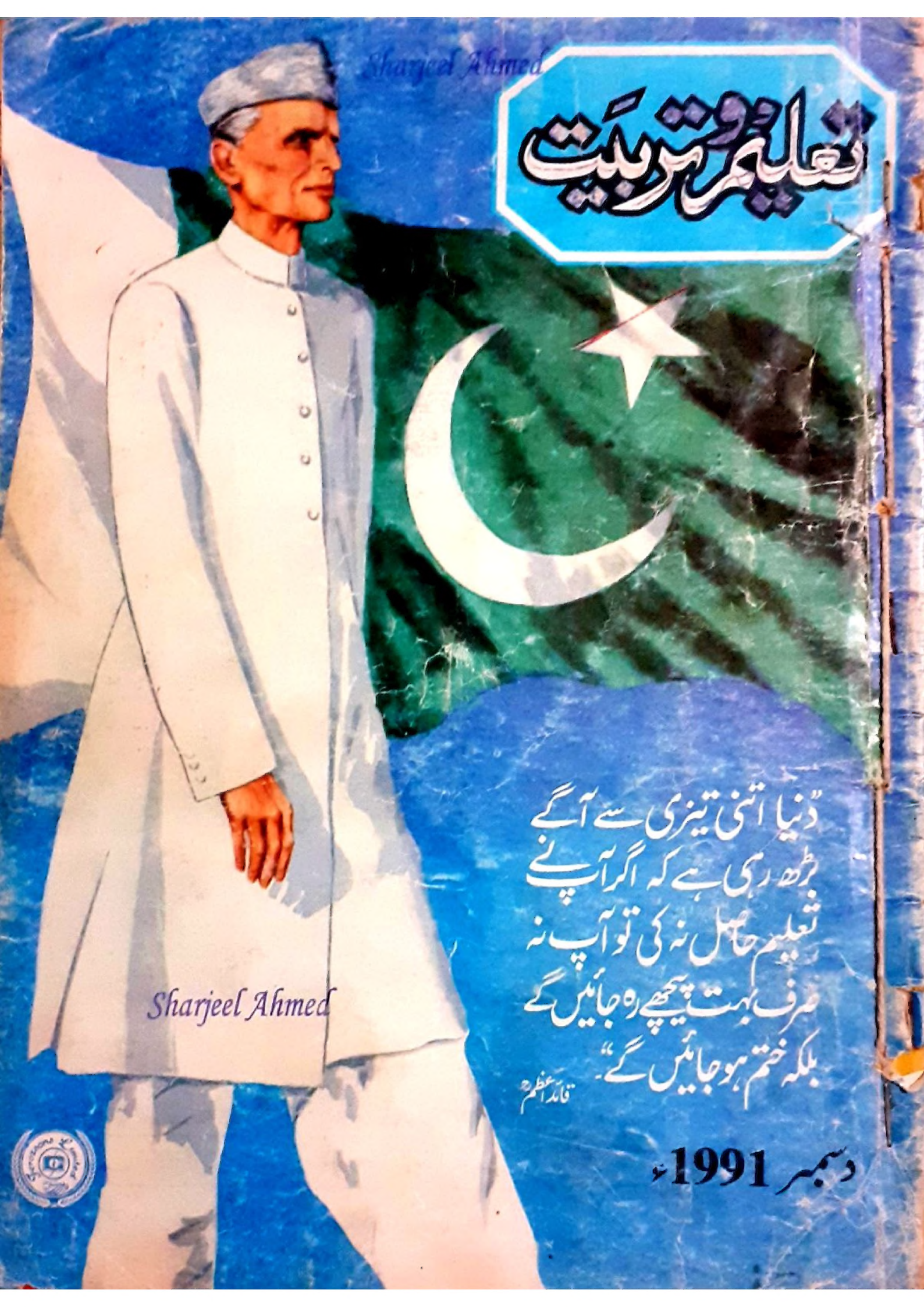

"دنیا اتنی تیزی سے آگے
بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے
تعلیم حاصل نہ کی تو آپ نہ
صرف بہت پیچھے رہ جائیں گے
بلکہ ختم ہو جائیں گے۔"

قائد اعظمؒ

Sharjeel Ahmed

دسمبر 1991ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلامُ علیکم

یہ دسمبر کا مہینا ہے، اور یہ مہینا برِّصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں اِس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اِس مہینے کی 25 تاریخ کو ہمارے محبوب قائدِ اعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے تھے، جن کی کوششوں سے دنیا کے نقشے پر ایک نیا اسلامی ملک، پاکستان، اُبھرا تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے محبوب قائد نے ہمیں جو نصیحتیں کی تھیں اگر ہم ان پر سچے دل سے عمل کریں تو ہمارا وطن جنّت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ آپ نے آزادی کے دوسرے دن، 15 اگست 1947 کو، فرمایا تھا:

"اب پاکستان کا آزاد اور خود مختار ملک قائم ہو چکا ہے اور (ہندوستانی) مسلمانوں کی وہ آرزو پوری ہو گئی ہے جس کے لیے انھوں نے سال ہا سال جدّوجہد کی تھی اور بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ اِس ملک کے بننے سے ہماری ذمّے داریاں بہُت بڑھ گئی ہیں۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم ایک قوم ہیں۔ ہم میں ذات پات کا کوئی فرق نہیں۔ ہم آپس میں مِل جُل کر محبّت اور امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

پھر آپ نے 26 اپریل 1948 کو ہمیں یہ نصیحت کی:

"آپ کو چاہیے کہ (اپنی صفوں میں) ویسا ہی اِتحاد قائم رکھیں جیسا پاکستان حاصل کرنے کے وقت موجود تھا۔ آپس کے جھگڑوں اور صوبائی نفرت سے اپنے آپ کو دُور رکھیں۔ اگر ہم متحد رہے تو بہت سی خرابیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صحیح طریقے اختیار کر کے اور خدا کی حمایت سے ہم پاکستان کو ایک بہُت بڑی طاقت بنا سکتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پیارے قائد کی تعلیمات و ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اِس شمارے میں

اداریہ 1
قائداعظم (نظم) عبدالحفیظ ظفر 2
جواب دو (کہانی) مرزا ادیب 3
انوکھی پک نک (کہانی) رضوانہ سید علی 7
انتخاب اشفاق احمد خاں 10
قرآنی کہانی ڈاکٹر عبدالرؤف 12
سنہری چڑیا (کہانی) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر 13
آیئے مسکرائیں 15
سردی آئی (نظم) امان اللہ نیر شوکت 16
وہ کون تھا؟ (کہانی) محمد یونس حسرت 17
دور بین کے بعد (مضمون) ن۔ ل 25
دونوں نے مل کر جھوٹ بولا (کہانی) مظہر الجلیل رومی 27
برقی آلات کیسے کام کرتے ہیں؟ شبانہ اسلام سلہری 30
تم ہی میرا دوست (کہانی) محمد اقبال ثاقب 33
بتایئے 36
ذہنی آزمائش 37
آہ! مقبول انور داؤدی 39
مدد کا پاس (کہانی) مقبول انور داؤدی (مرحوم) 40
آیئے دوست بنائیں 41
آپ کا خط 42
آپ بھی لکھیے 44
بارہ مہینے (نظم) تاج انصاری 49
ہونہار مصور 50
جگنو (کہانی) ن۔ ل 51
اقبال یقین 55
عظیم مسلمان معین الحق فریدی 56

...واں سال ...واں شمارہ

تعلیم و تربیت

...میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
...بچوں کا محبوب رسالہ

...یٹر: عبدالسلام
ظہیر سلام
...ٹ ایڈیٹر: سید لخت
...ٹ: ڈاکٹر عبدالرؤف
...ٹ ایڈیٹر: محمد اقبال ثاقب
...: محمود حسن رومی
...: الطاف احمد
...: شہزاد اصغر
...: محمد انور بھٹی
...: فاروق عالم
...: محمد بشیر راہی
...فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
ظہیر سلام
عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
... شارع بن بادیس لاہور
...: 361309-361310

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
... شاہراہ قائداعظم لاہور
فون: 301196-97

سالانہ قیمت
...ستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) -/200 روپے
...وسطی/افریقہ (ہوائی ڈاک سے) -/250 روپے
... (ہوائی ڈاک سے) -/300 روپے
...مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) -/330 روپے

...فی پرچہ -/9 روپے دسمبر 1991

سرورق: قائدِ اعظم

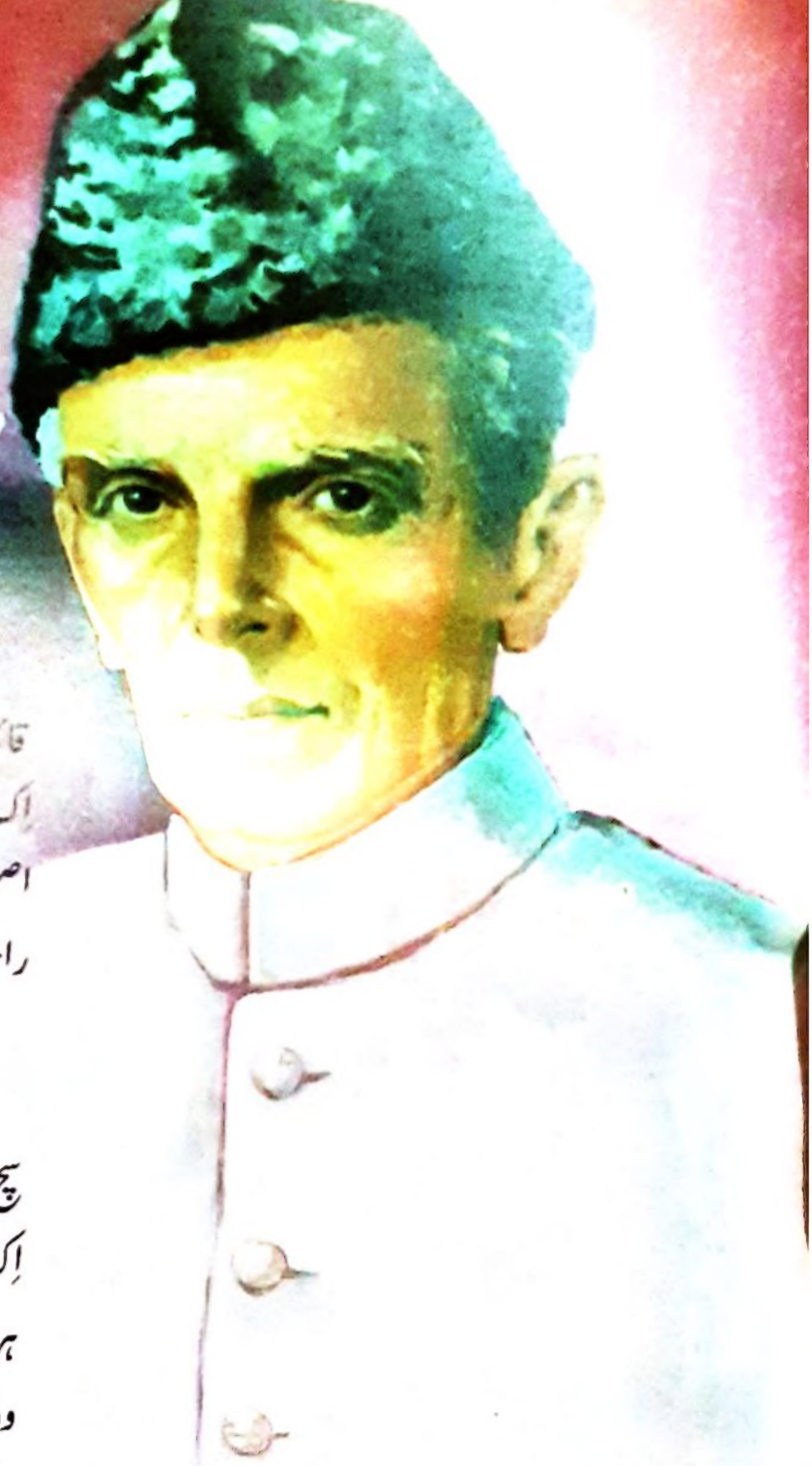

قائدِ اعظمؒ

عبدالحفیظ ظفر

قائدِ اعظمؒ عظیم اِنسان تھے
اِک علیٰحدہ قوم کی پہچان تھے
اصل میں وہ غم زدوں کے واسطے
راحت و آرام کا سامان تھے
قائدِ اعظمؒ عظیم اِنسان تھے

سچ ہے یہ، وہ قوم کی تقدیر تھے
اِک سُہانے خواب کی تعبیر تھے
ہر بشر کو اُن کی اُلفت تھی عزیز
وہ ہر اِک مظلوم کا ارمان تھے
قائدِ اعظمؒ عظیم اِنسان تھے

باغِ دُنیا میں بڑے مقبول تھے
وہ چمن کا اِک مہکتا پھول تھے
اُن کی عظمت کیا بتاؤں اب ظفرؔ
ہم بھلا کیا، غیر بھی حیران تھے
قائدِ اعظمؒ عظیم اِنسان تھے

میرزا ادیب

جواب دو

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ یہ سردیوں کی رات تھی۔ لوگ کمبل اور لحاف اوڑھ کر سو گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی گاڑی کے ہارن کی آواز گونج اُٹھتی تھی یا تانگے کی کھٹ کھٹ سُنائی دے جاتی۔ ایسے میں شہر کے نامور ڈاکٹر مظہر علی کے بنگلے میں ایک کمرے کے اندر بلب جل رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا اکلوتا بیٹا اظہر علی کئی دنوں سے آدھی رات سے کچھ زیادہ وقت تک پڑھتا رہتا تھا۔ وہ عموماً ہر امتحان میں اوّل یا دوم آتا مگر آٹھویں اور نویں کے امتحانوں میں مسلسل دوم آیا تھا اور اُس نے عہد کر رکھا تھا کہ دسویں جماعت بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کرے گا۔ اور اپنے اسی عہد کو پورا کرنے کی خاطر وہ کافی دیر جاگ کر تیاری کرتا تھا۔ ابھی امتحان شروع ہونے میں تین روز باقی تھے اور وہ باقاعدگی سے اپنے پروگرام پر عمل کر رہا تھا۔

اُردو کی کتاب کے آخری صفحے کو ختم کرنے کے بعد اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں۔

"اب مجھے سو جانا چاہیئے" اُس نے سوچا اور کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ پھر ٹیبل لیمپ بُجھایا اور لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ یکایک سوتے میں اُس نے محسوس کیا کہ کوئی آواز آ رہی ہے۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔

اُس نے آواز سُننے کی کوشش کی مگر فضا میں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ اُس نے لحاف سے اپنا چہرہ بھی ڈھانپ لیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ پھر وُہی آواز آئی۔

"شاید کال بیل ہے" اُس کے ذہن میں خیال آیا۔

اُس کے ابّو ڈاکٹر تھے۔ کبھی کبھی کوئی مریض رات کے وقت آ کر کال بیل بجا دیتا اور جب اُسے احساس ہوتا کہ کسی نے کال بیل بجائی ہے تو اُسے افسوس ہوتا کیوں کہ اُس کے گھر کا دروازہ کبھی نہیں کھلتا تھا۔ آنے والا مایُوس ہو کر یا تو خود ہی چلا جاتا یا گھر کا کوئی نوکر اُسے یہ کہہ کر چلے جانے کے لیے کہہ دیتا کہ ڈاکٹر صاحب رات کے وقت کسی مریض کو نہیں دیکھتے۔ دس بجے ہسپتال آنا۔

کال بیل کی آواز وقفے وقفے سے برابر آنے لگی تو اظہر کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر بلب جلا دیا اور پلنگ کی پُشت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

نوکر عام طور پر خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ آنے والا خود ہی نا اُمید ہو کر چلا جاتا۔ اور اِس وقت بھی وہ یہی اُمید لگائے بیٹھا رہا۔ ایک منٹ تک خاموشی رہی، پھر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اظہر کا جی چاہا کہ جا کر دیکھے کہ آخر یہ ہے کون۔ ممکن ہے مریض نہ ہو، کوئی مہمان ہو۔ اُن کے کئی رشتے دار بیرونی ملکوں میں رہتے تھے اور دو تین ماہ بعد کوئی نہ کوئی آ جاتا تھا۔ یہ سوچ کر اظہر نے کوٹ پہنا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

بنگلے کا بڑا دروازہ کچھ فاصلے پر تھا۔ پہلے باغیچہ تھا۔ اُس کے بعد خالی زمین تھی۔ پھر دروازہ تھا۔ اظہر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"بابُو!" یہ اُن کے نوکر نواز کی آواز تھی۔

"سُن نہیں رہے؟ بار بار کال بیل بج رہی ہے" اظہر نے سخت لہجے میں کہا۔

"سُن رہا ہوں ـــ کوئی مریض ہے، تنگ کرنے کے لیے آ گیا ہے" نواز نے جواب دیا۔

"کوئی مہمان بھی تو ہو سکتا ہے"۔

"نہیں بابُو۔ یہ کوئی مہمان نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے کوئی مریض ہے ـــ بس مُنہ اُٹھائے چلے آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رات کو کب کسی کو دیکھتے ہیں۔ بابُو، تم کو بھی خبر ہے۔"

نواز نے اپنی طرف سے معاملہ ختم کر دیا لیکن اظہر دروازے کے پاس پہنچ گیا اور اُس کا ہاتھ کُنڈی کی طرف بڑھنے لگا۔

نواز گھبرا گیا "کیا کرنے لگے ہو بابُو؟ ڈاکٹر صاحب ناراض ہوں گے"۔

"ذرا ٹھہرو تو۔ مجھے معلوم تو کر لینے دو کہ کون ہے"

"نہ بابُو نہ۔"

نواز نے بڑا رد کا مگر اظہر نے کُنڈی کھول دی۔ دروازے کے سامنے ایک عورت دُبلے پتلے زرد رُو بچے کو سینے سے لگائے کھڑی تھی اور اُس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔

اظہر کو دروازے پر دیکھ کر مرد آگے بڑھا اور بولا "ڈاکٹر صاحب جی ـــ"

اس سے پیشتر کہ وہ اپنا فقرہ مکمّل کرتا، نواز دُرُشت لہجے میں بولا "ڈاکٹر صاحب اِس وقت نہیں ملتے۔"

اب عورت بھی آگے بڑھی۔ اُس نے کہا "میرا بچّہ بڑا بیمار ہے۔ کہ دیں ڈاکٹر صاحب سے ذرا۔"

"نہیں۔ کہ جو دیا کہ نہیں مل سکتے ـــ صبح ہسپتال آنا۔ ـــ جاؤ اب۔" یہ کہہ کر نواز دروازہ بند کرنے لگا۔

"ٹھہرو نواز! میں ابُو کو بتاتا ہوں۔"

اظہر تیزی سے اپنے ابّو کی خواب گاہ کی طرف گیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

دروازہ کھُلا۔ اظہر کی امّی باہر آئیں۔ "اظہر بیٹا، کیا بات ہے؟" اُنہوں نے پوچھا۔

"امّی، ایک عورت کا بچّہ بہت بیمار ہے۔"

"کیا ہے، رضیّہ؟" ڈاکٹر صاحب کی اندر سے آواز آئی۔

"اظہر ہے۔ کہتا ہے کوئی بچّہ بہت بیمار ہے ___"

ڈاکٹر صاحب کی اندر ہی سے آواز آئی "تو میں کیا کروں"؟ اُن کے لہجے میں غُصّہ تھا۔

"ابّو! فوراً علاج نہ ہُوا تو ___"

"دیکھ لیں" اظہر کی امّی بولیں۔

ڈاکٹر صاحب باہر آ گئے "رضیہ بیگم، تم بھی اپنے بیٹے کے ساتھ پاگل ہو گئی ہو؟ سارا دن ہوتا ہے علاج مُعالجے کے لیے۔ یہ لوگ راتوں کو کیوں تنگ کرتے ہیں!"

اب نواز بھی آ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُس سے کہا "تم تو سب کچھ جانتے ہو۔ پھر یہ کیا ہو رہا ہے"؟

"میں نے تو بابُو جی سے کہا تھا۔ یہ نہیں مانے۔ اِدھر آ گئے۔"

"تو جاؤ، کہ دو اُن سے، ڈاکٹر صاحب رات کے وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔"

نواز جانے لگا

"ذرا دیکھ لیتے ___" رضیہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

بیگم کی بات سُن کر ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں بڑے غُصّے سے دیکھا اور بولے "یہ اُصول کی بات ہے۔ چلو، اندر، اور اظہر تم بھی اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ ___ جاؤ ___"

اظہر اپنے کمرے میں پہنچا تو اُس کا دل بھر آیا اور وہ ایک صوفے کی پُشت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیمپ جل رہا تھا۔ اُس کی روشنی آنکھوں میں چُبھنے لگی تو اُس نے دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ لیے۔

آنسو بہتے رہے اور پھر تھم گئے۔ ابھی تک اُس کے ہاتھ وہیں تھے۔ یکایک ہاتھوں کو ٹھنڈک سی لگی اور ساتھ ہی آواز آئی "اظہر بیٹا!"

اتنی مٹھاس اور ملائمت ماں کے سوا کس کی آواز میں ہو سکتی ہے۔ اُس نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

"میں جانتی ہوں، بیٹا، ___ تمہیں دُکھ ہُوا ہے۔"

اظہر نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ امّی اُس کے پاس بیٹھ گئیں اور اُسے برداشت کی تلقین کرنے لگیں۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ وہ گرج کر بولے:

"رضیہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"جاتی ہُوں" اور امّی اظہر کی پیشانی چُوم کر کمرے سے نکل گئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ اُن کے بیٹے کو دُکھ ہُوا ہے، اِس لیے وہ ہر روز شام کے قریب وقت نکال کر اُسے سیر کے لیے لے جانے لگے۔ اُنہی دِنوں کراچی سے اظہر کی خالہ جان بھی اپنے بچّوں کے ساتھ آ گئیں۔ پندرہ دِن گھر میں خوب ہنگامے سے رہے۔ اظہر کا دل بہل گیا۔ لیکن کبھی کبھی یہ واقعہ یاد آ جاتا تو اُس کا دل مغموم ہو جاتا تھا۔

وہ رات بڑی سرد تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں اِسلام آباد چلے گئے تھے۔ دونوں نوکروں نے بھی ایک ایک دن کی چھٹّی لے رکھی تھی۔ گھر میں اظہر تھا، اُس کی امّی تھیں اور بُوڑھی مُلازمہ تھی جسے وہ اماں کہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب باہر جاتے تھے تو اظہر ماں ہی کے کمرے میں سوتا تھا۔

اس رات بھی وہ وہیں سو رہا تھا۔

اُس کی امّی کی طبیعت شام ہی سے کچھ خراب تھی۔ پہلے بھی کبھی کبھی ایسا ہو جاتا تھا۔ اُس کے ابّا جان فوراً دوا دے دیتے تھے۔ اُس رات وہ نہیں تھے اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، امّی کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ پھر اُنہیں قے پر قے آنے لگی۔

اظہر ماں کے پلنگ کے پاس کھڑا تھا اور بار بار بے چین ہو کر پُوچھ رہا تھا "امّی، کیا ہُوا؟ امّی کیا ہُوا؟" شور سُن کر اماں کمرے میں آ گئی۔

"قہوہ" امّی کے ہونٹوں سے بہ مُشکل نکلا۔ عام طور پر قہوے کا ایک کپ پینے سے قے رُک جاتی تھی ـــ اماں قہوہ لے آئی۔

امّی نے قہوہ پیا مگر دوسرے ہی لمحے سارا کا سارا باہر آ گیا۔

اظہر اور اماں کی پریشانی بڑھتی گئی۔ قے رُکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

"ڈاکٹر کو بُلاؤ، بابُو!" اماں نے گھبرا کر کہا۔

امّی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور لگتا تھا وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ اِسی حالت میں بقیہ رات بیت گئی۔

صبح سات بجے ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ اُنہوں نے فوراً بیوی کے اِنجکشن لگایا اور اظہر سے گرج کر بولے "ڈاکٹر کو نہیں بُلایا تھا؟"

اظہر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں نہیں بُلایا؟ تم میرے کئی ڈاکٹر دوستوں کے ٹیلی فون نمبر جانتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں ایسا کیوں کیا تم نے؟"

"جی ـــ وہ ـــ ابّا جی ـــ"

"جواب دو!"

"ابّا جی، آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ ڈاکٹر رات کو مریض نہیں دیکھتے۔"

یہ سُنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی نظریں جُھک گئیں۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اُن کے ماتھے پر شرمندگی کے قطرے جِھلملانے لگے۔

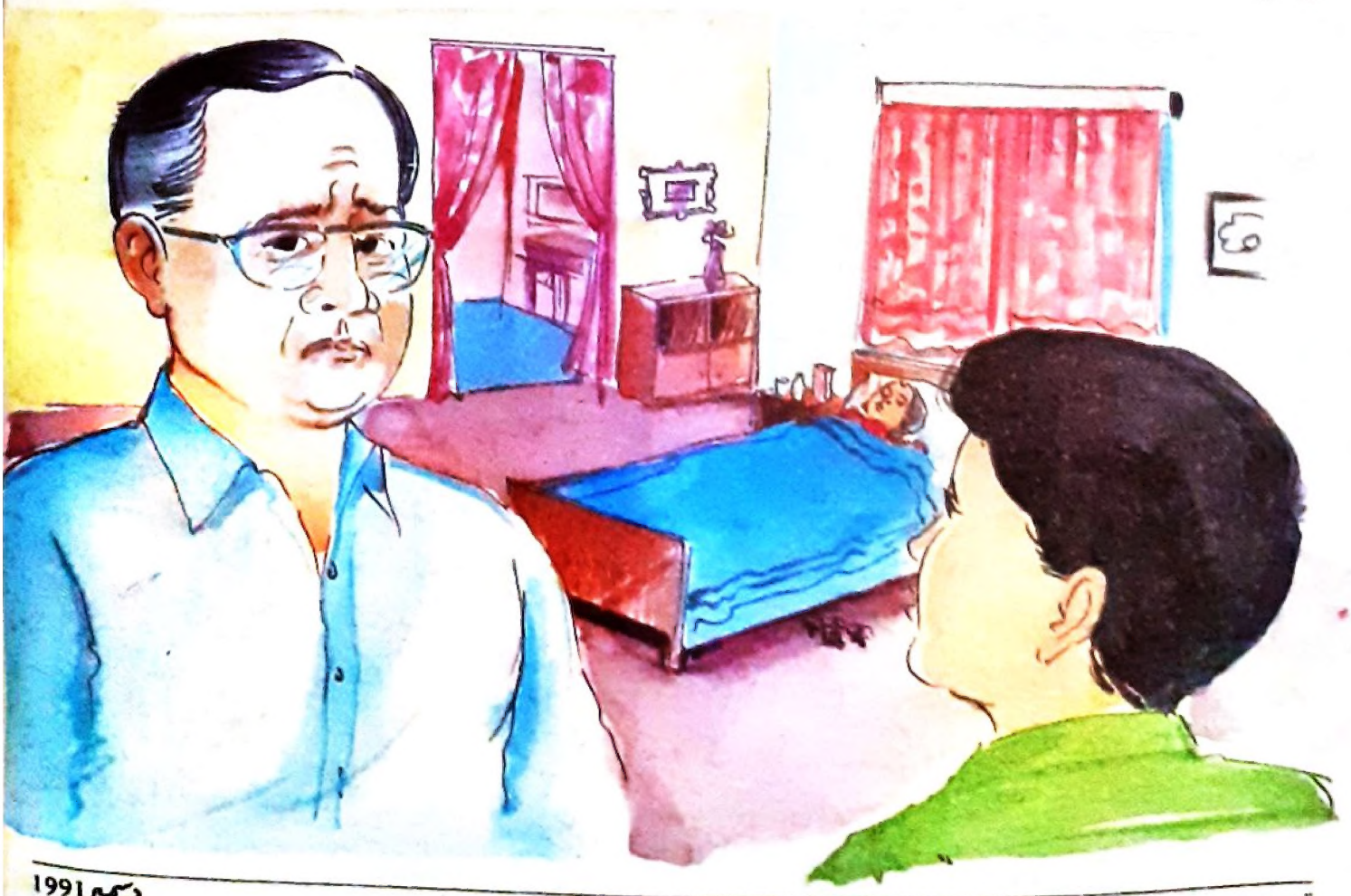

انوکھی پکنک

رضوانہ سید علی

نادر نتھیا گلی سے کچھ آگے ایک ہرے بھرے گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ گاؤں ایک خوب صورت وادی میں تھا۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ اور گنگناتے جھرنے تھے۔ نادر کے ابّا مُراد علی کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس میں وہ مکئی، آلو، پیاز اور ٹماٹر کاشت کرتے تھے۔ انہوں نے سیب اور اخروٹ کا ایک باغ بھی لگا رکھا تھا۔

جب گرمیوں کا موسم آتا اور پہاڑوں پر برف پگھلنے لگتی تو یہ علاقہ اتنا خوبصورت ہو جاتا جیسے بہار نے اپنے سارے رنگ اسے دے دیے ہوں۔ لوگ دُور دُور سے اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ تب مُراد علی اپنے مکان کا اُوپری حصّہ باہر سے آنے والے کسی خاندان کو کرائے پر دے دیتے۔ وہ اُسے سارے علاقے کی سیر بھی کراتے اور اس طرح وہ ٹُورسٹ گائڈ کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔

ویسے خود نادر بھی اپنے علاقے کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ اُس کا اسکول گاؤں سے کئی میل دُور تھا اور وہ یہ فاصلہ پیدل طے کرتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ گھنے جنگلوں میں کون کون سے جانور رہتے ہیں، کہاں جھرنے ہیں اور کہاں جھاڑیوں میں مزے دار پھل لگتے ہیں۔ لہٰذا چھٹّی کے روز مہمان خاندان کو گھمانے پھرانے کی ڈیوٹی اکثر اُسی کے ذمّے تھی۔

اس مرتبہ گرمیوں میں کراچی کا ایک خاندان نادر کے گھر آکر ٹھہرا۔ اس خاندان میں بچّے بھی تھے۔ عامرہ، نسیم اور عامر۔ عامر نادر کا ہم عُمر تھا۔ اس لیے دونوں میں جلد ہی دوستی ہو گئی۔ میدانی علاقوں میں طویل چھٹّیاں شدید گرمی کے موسم میں ہوتی ہیں اور پہاڑی علاقوں میں شدید سردی کے موسم میں، جب برف باری کی وجہ سے راستے بالکل بند ہو جاتے ہیں۔

نادر صبح کو تو اسکول چلا جاتا تھا مگر واپس آکر اپنے دوست کے ساتھ گھومتا پھرتا۔ پہاڑوں پر رہنے والے لوگ ویسے بھی دل کے بہت اچھّے اور سچّے ہوتے ہیں۔ بناوٹ اور مکّاری اُن میں بالکل نہیں ہوتی۔ جس سے دوستی کرتے ہیں، دل سے کرتے ہیں۔ عامر بھی بہت اچھّا بچّہ تھا اس لیے جلد ہی دونوں آپس میں گھُل مل گئے۔

عامر نادر کو کراچی کی باتیں سُناتا جہاں رات کو روشنیاں مُسکراتی ہیں اور کھُلے سمندر پر جہاز مُرغابیوں کی طرح تیرتے ہیں۔ نادر حیرانی سے یہ باتیں سُنتا۔ اُس نے جھاگ اُڑاتے

دریا اور گُن گناتے جھرنے تو دیکھے تھے، خاموش جھیلوں کے حُسن سے بھی واقف تھا، مگر نیلا سمندر جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا، اُس کے بارے میں سوچ کر وہ پریشان ہو جاتا۔

عامر نے اُسے کراچی آنے کی دعوت دی تھی، اور اُس نے پکّا اِرادہ کرلیا تھا کہ اِس مرتبہ چھٹیوں میں وہ ضد کر کے کراچی ضرور جائے گا اور اُن روشنیوں کو دیکھے گا جو رات کو دن بنا دیتی ہیں۔ اُس نیلے سمندر کو دیکھے گا جس کا دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا۔ ویسے ابھی تو وہ عامر کو حسین سبزہ زار، دل فریب چشمے اور گُنگناتی وادیاں دِکھا کر حیران کر رہا تھا۔

ایک روز عامر کے ابّو نے بچّوں کی فرمائش پر جنگل میں پک نِک منانے کا فیصلہ کیا۔ پروگرام چھٹی کے دن کا رکھا گیا تاکہ نادِر بھی اُس میں شریک ہو سکے۔ بچّوں کا خوشی سے بُرا حال تھا۔ اُنہوں نے جنگلوں کی کہانیاں تو بہت پڑھی تھیں، کچھ جنگل فلموں میں بھی دیکھے تھے اور کچھ آجکل پہاڑوں پر دور دور سے نظر آتے تھے۔ مگر سچ مُچ کے جنگل اُنہوں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ گھنے جنگل کو اندر سے دیکھنا چاہتے تھے۔

جنگل میں جانے سے پہلے عامر کے ابّو نے اچھی طرح سے تسلّی کر لی کہ اِن جنگلوں میں کہیں درندے تو نہیں ہیں۔ اُنہیں بتایا گیا کہ برفانی چیتا، پہاڑی بکرے، لومڑی، بھیڑیا، ریچھ اور سانپ جیسے جانور اُن جنگلوں میں پائے جاتے ہیں جو بہت بلندی پر ہیں۔ یہ جانور پہاڑوں سے نیچے نہیں آتے۔ آبادی کے قریب جو جنگل ہیں، اُن میں تو ہماری عورتیں اور بچّے لکڑیاں وغیرہ چُننے کے لیے جاتے ہیں۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر جنگل کی سیر کو جائیں۔

اور اگلے دن صبح سویرے اُن کی جیپ جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ بَل کھاتا راستہ اور اُس کے دونوں طرف ہریالی دیکھ کر بچّوں کو بہت مزہ آ رہا تھا۔ وہ تالیاں بجاتے اور گیت گاتے جا رہے تھے۔ نادِر کے لیے تو یہاں کی کوئی چیز بھی نئی نہ تھی۔ وہ تقریباً روز ہی اِدھر سے گزرتا تھا۔ بلکہ ایک روز جب وہ اِس راستے سے گزر رہا تھا تو ایک دم کوئی سُرخ سُرخ چیز جھٹ سے اُس کے قدموں میں آگری تھی۔ نادر نے گھبرا کر دیکھا تو وہ کسی کا دِل تھا۔ اُسے دیکھ کر اس کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ شاید اُوپر بلندی پر کسی چٹان پر کوئی درندہ کسی چھوٹے جانور کو کھا رہا تھا۔ اُس نے ایک دم وہاں سے دوڑ لگا دی۔ اُس دن کے بعد وہ جب بھی وہاں سے گزرتا اُسے وہ ننّھا سا دِل یاد آ جاتا اور وہ چونک کر اُوپر دیکھنے لگتا۔ آج وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اُسی راستے سے گھنے جنگل کی طرف جا رہا تھا۔

چلتے چلتے اُن کی جیپ ایک چشمے کے کنارے پہنچی۔ یہاں گھنے درختوں تلے ہری ہری گھاس کا فرش بچھا ہُوا تھا۔ جنگلی پھولوں کی جھاڑیوں میں رنگ برنگ پھول مسکرا رہے تھے۔ اُن کی باس سے سارا علاقہ مہک رہا تھا۔ عامر کے ابّو کو یہ جگہ پک نِک کے لیے بہت اچھی لگی۔ چُنانچہ اُنہوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ جیپ میں سے دری نکال کر ہری ہری گھاس بچھا دی گئی۔ عامر جھاڑیوں سے پھول توڑ کر گلدستہ بنانے لگی۔ نسیم چشمے کے پانی میں اچھلتی ننّھی ننّھی مچھلیوں کو دیکھنے لگا۔ عامر

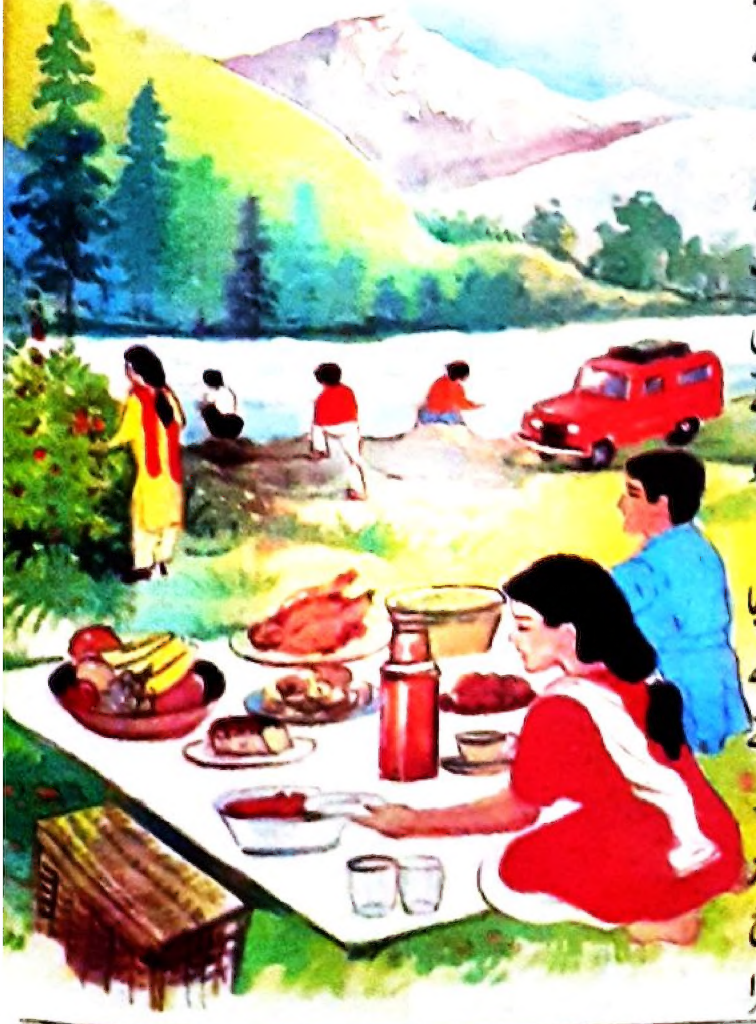

اور نادر کنارے پر پڑے خوبصورت رنگین پتھر چننے لگے۔ امّی اور ابّو دسترخوان پر کھانے پینے کی چیزیں چننے لگے۔ نادر کے ابّو مُراد علی ایک بُوٹی تلاش کر رہے تھے جو کسی دوا میں استعمال کی جاتی ہے۔

اب وہ مزے کی بات سُنیے جس پر ہماری کہانی کی بُنیاد ہے۔ اِسی چشمے کے منبع کے قریب ایک چٹان کی آڑ میں ایک کھوہ تھی۔ منبع اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے اور کھوہ قُدرتی بنے ہوئے غار کو کہتے ہیں۔

ٹھنڈے مقامات پر چشموں اور جھرنوں کے قریب ایسے غار یا کھوہیں جنگلی درندوں کے پسندیدہ مقام ہوتے ہیں اور شیر، چیتے اور ریچھ وغیرہ اپنے ٹھکانے عموماً ایسی جگہوں ہی پر بناتے ہیں۔

ہاں تو، جس کھوہ کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے اُس میں بھی ایک مادہ بھالُو (ریچھنی) اپنے تین بچّوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ننھّے ننھّے سے یہ تین بھالُو پُورے شیطان کے خالُو تھے۔ ویسے چٹور پنے میں اُن کی ماں اُن سے بھی کئی ہاتھ آگے تھی۔

جس روز عامر اور نادر پک نک کے لیے آئے تھے اُس روز صبح ہی صبح پہلے تو امّی بھالُو نے بڑے جتن سے شہد کے ایک چھتّے پر سے مکھیاں اُڑائیں اور پھر مزے لے لے کر پورے چھتّے کا شہد چاروں نے مِل کر چَٹ کر ڈالا۔ اِس کے بعد ایک جھاڑی کی شامت لائے، جس پر ایک بڑا مزیدار کھٹ مٹھا سا پھل لگا تھا۔ جھاڑی پھلوں سے لدی کھڑی تھی۔ مگر اِن ندیدوں نے اُس پر ایک پھل بھی نہ چھوڑا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر سبھی اُڑا لیے۔ اب امّی بھالُو کا اِرادہ تھا کہ چشمے پر جا کر مچھلیاں پکڑی جائیں۔

عامر اور اس کے گھر والے جہاں پک نک منا رہے تھے، وہ جگہ اِن بھالوؤں کی کھوہ سے کوئی دو میل نیچے تھی۔ امّی بھالو اپنے بچّوں کو لے کر ذرا نیچے اُس جگہ اُتری جہاں چشمے کا پانی پتھروں میں جگہ بنا کر بہتا ہے تاکہ آس پاس کے گڑھوں میں تیرنے والی مچھلیوں کو پکڑ سکے تو اچانک اُس کے نتھنوں میں ایک عجیب سی خُوشبو آئی۔ وہ مچھلیوں کو بھول کر کھڑی کی کھڑی رہ

گئی اور غور کرنے لگی کہ یہ خوشبو کس چیز کی ہے ـــــ شہد کی خوشبو، جنگلی پھولوں کی مہک اور مچھلیوں کی باس سے وہ خوب واقف تھی، لیکن یہ خوشبو بالکل نئی اور دل کو کھینچ لینے والی تھی۔

دراصل اُس وقت ہَوا کا رُخ نیچے سے اُوپر کی طرف تھا اور ہَوا اُن کھانوں کی خوشبوؤں کو بیگم بھالُو کی ناک تک پہنچا رہی تھی جو عامر کی امّی دسترخوان پر چُن رہی تھیں۔

امّی بھالُو کچھ دیر تک تو غور کرتی رہی اور پھر سیدھی خوشبو کے تعاقُب میں چل دی۔ اُس کے ننھّے مُنّے بچّے بھی اُچھلتے کُودتے اُس کے پیچھے تھے۔ اِدھر سب لوگ دسترخوان پر جمع ہو رہے تھے کہ ایکا ایکی جھاڑیوں میں کچھ کھڑبڑ ہوئی اور پھر ایک موٹے تازے بھالُو کا چہرہ نمُودار ہُوا جسے سب سے پہلے مُراد علی نے دیکھا۔ اُنہوں نے اپنے حواس برقرار رکھے اور بھالُو پر نظریں جمائے سب کو تنبیہ کی:

"خبردار! کوئی نہ چیخے۔ باری باری اُٹھو اور بولے بغیر

جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤ"۔

سب نے ایسا ہی کیا جیسا نادر کے ابّو نے کہا تھا۔ آخر میں عامر کے ابّا اٹھے اور جیپ میں جا کر اُنھوں نے اُس کے دروازے لاک کر کے شیشے چڑھا لیے۔ اب بچّوں کے مُنہ سے چیخیں نکلنے لگیں "دیکھیے! ذرا دیکھیے!۔ ایک نہیں، کئی بھالو، ہیں! ارے! یہ تو بچے ہیں!"

بھالو بے چارے تو خود انسانوں سے گھبرا رہے تھے۔ اگر اُنہیں کوئی نہ دیکھتا تو شاید کچھ دیر بعد خود ہی ڈر کر واپس لوٹ جاتے مگر اوّل تو اِنسان خود ہی جا کر ایک ڈبّے میں غائب ہو گئے، دوسرے کھانے پینے کی چیزیں وہیں پڑی رہ گئیں۔ لہٰذا بیگم بھالو اور اُس کے بچے جھاڑیوں سے باہر نکل آئے اور دسترخوان کے گرد بالکل اُسی طرح بیٹھ گئے جیسے کچھ دیر پہلے وہ لوگ بیٹھے تھے۔ پھر کوئی آلو بخاروں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تو کوئی کیلے اُڑانے لگا۔ بیگم بھالو کے ہاتھ جوس کا ایک ڈبّا آ گیا۔ اُس نے اُسے اپنے تیز پنجوں سے نوچا تو سارا جوس اُس کے اُوپر گر گیا۔ لیکن وہ سمجھ گئی کہ ہے یہ کوئی کھانے پینے کی چیز — بس پھر کیا تھا، دوسرا ڈبّا اٹھا کر اُس میں اپنے تیز ناخن سے ایک چھوٹا سا سوراخ کیا اور پھر بھاڑ سا مُنہ کھول کر پُورا ڈبّا اُس میں اُلٹ لیا اور پھر جو پھندا لگا ہے تو کھانستے کھانستے بے حال ہو گئی۔ اِتنے میں بچّے بھی جُوس کے ڈبّے اُٹھا اُٹھا کر اُن میں نہانے لگے۔ اِس پر بیگم بھالو کو غصّہ آ گیا اور اُس نے قریب بیٹھے بچّے کو ایک ایسا زور دار تھپّڑ جڑا کہ وہ لُڑھکنیاں کھاتا ہُوا دُور جا گرا۔

جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"بھئی واہ! مزہ آ گیا!" عامرہ بولی۔

"اِتنا خود کھا کر مزہ نہ آتا جتنا اِن بھالوؤں کو دیکھ کر آ رہا ہے" نسیم نے کہا۔

امّی ہنستے ہوئے کہنے لگیں "مزہ تو آ رہا ہے مگر اب بھالو کو غُصّہ آ گیا ہے۔"

"ہاں" عامر کے ابّو نے کہا "یہ غالباً بچّوں کی ماں ہے۔ غُصّے میں کہیں ہمارا گھیراؤ نہ کر لے۔ مُراد علی! بھاگو!"

اور نادر کے ابّا نے فوراً جیپ اِسٹارٹ کر دی۔ سب بھالوؤں کی پک نک پر ہنستے مسکراتے وہاں سے چل دیے۔ (مرکزی خیال انگریزی سے لیا گیا۔)

اِنتخاب

اشفاق احمد خاں

وہ محمد علی تھا۔ اِنگلستان کی زمین پر قدم رکھتے ہی راہوں پر پھیلی دُھند اور رگوں میں خون جما دینے والی سردی اُس کا اِستقبال کر رہی تھی۔ اپنا وطن چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں آنے کا محمد علی کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ تنِ تنہا علم حاصل کرنے کے لیے اِس دُور دراز کے دیس میں آیا تھا۔ اپنے دیس میں دوستوں اور ملنے جلنے والوں نے اُس کو پردیس کے موسم سے بہت ڈرایا تھا۔ لیکن وہ ڈرنے والا نہیں تھا۔ خصوصاً علم کے حصول کی راہ میں آنے والی رُکاوٹوں کو وہ اِتنی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ پھر اُسے اپنی ذات پر اِعتماد تھا۔

اُسے اپنی اُس مُستقل مزاجی پر فخر تھا جو اُس کی ذات کا نُمایاں وصف تھی۔

اُسے اپنے بچپن کا وہ دن یاد تھا جب وہ اپنے علاقے کی کچہری میں گیا تھا اور ایک وکیل کو لمبے گاؤن اور وکیلوں والی ٹوپی میں دیکھ کر حیران ہُوا تھا۔ اُس نے اپنے والد سے جو اُس کے ہمراہ تھے. پوچھا تھا "یہ کون ہے؟"

والد نے جواب دیا تھا "یہ وکیل صاحب ہیں۔"

"میں بھی وکیل بنُوں گا" محمّد علی نے بڑے جوش سے کہا تھا۔

اِبتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گھر میں محمّد علی کے مُستقبل کے مُتعلق بات چیت ہونے لگی۔ تب اُس کو اپنے اُس عزم اور خواہش کی یاد آئی۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کی یہ خواہش اِس ملک میں پوری نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لیے اُسے اِنگلستان جانا پڑے گا۔ ایک تاجر کے بیٹے کی یہ خواہش بڑی عجیب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب اُسے اپنے باپ کے ساتھ کاروبار کرنا پڑے گا۔ لیکن یہاں اُسے غیب سے اِمداد مل گئی۔ اُس کے والد کا ایک دوست انگریز تاجر اُسے بہت پسند کرتا تھا۔ اُس نے اُس کے والد سے کہا "اِس لائق نوجوان کو تجارت میں نہ پھنساؤ۔ اِس کو مزید تعلیم کے لیے اِنگلستان بھیجو۔"

اور یُوں محمّد علی کے اِنگلستان جانے کی راہ ہموار ہُوئی۔ اُس زمانے میں یہ آسان نہ تھا کہ ایک لڑکا تعلیم حاصل کرنے سمندر پار جائے۔ اِس لیے محمّد علی کے گھر والے خوف زدہ تھے۔ لیکن 16 سالہ محمد علی خوش اور پُراِعتماد تھا۔ اُس نے اُن سے کہا "آپ مجھ پر فخر کریں گے جب میں اِنگلستان سے واپس آؤں گا ــــ اور میرا وطن بھی مجھ پر فخر کرے گا۔"

اِس طرح یہ بلند حوصلہ نوجوان اِنگلستان پہنچا۔ اُس نے بہت قلیل مُدّت میں اپنے آپ کو اُس ملک کے موسم کے مُطابق ڈھال لیا۔ اُس نے اپنے رہنے کے لیے جو کمرا لیا تھا وہاں گرم پانی کا اِنتظام نہ تھا۔ موسمِ سرما کے برفیلے پانی کا تصوّر ہی جسم میں کپکپی دوڑا دیتا ہے۔ اِسی وجہ سے وہاں رہنے والے دوسرے لڑکے صبح کے وقت نہانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن محمّد علی صبح سویرے غسل کی عادت کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ لڑکے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ ٹھنڈے پانی میں بڑے مزے سے نہاتا ہے۔

اب محمّد علی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کسی ایسے تعلیمی اِدارے کا اِنتخاب تھا جہاں وہ وکالت کی تعلیم حاصل کر سکے۔ اُس کے عزیزوں اور ملنے جُلنے والوں نے اُسے مُختلف تعلیمی اِداروں کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اُن اِداروں میں گیا جہاں بار ایٹ لا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن دل اور دماغ دونوں ہی مُطمئن نہ ہوئے۔ دن پر دن گزرتے گئے اور تعلیمی اِدارے کا اِنتخاب نہ ہو سکا۔

ایک دن محمّد علی "لنکن اِن" نامی اِدارے کے دروازے پر آیا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُس کے دل نے کہا کہ یہی اُس کی منزل ہے۔ پھر اُس وقت اُس کا دِل مَسرّت سے لبریز ہو گیا جب اُس نے دروازے پر اِنسانوں کو قانون دینے والے عظیم لوگوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سرِفہرست لکھا ہوا دیکھا۔ اُس نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اِسی اِدارے میں داخلہ لے گا کیوں کہ اِس کے بانی اِتنے روشن خیال ہیں کہ غیر مسلم ہونے کے باوجود انہوں نے پیغمبرِ اِسلامؐ کی عظمت کو پہچانا۔

پھر وقت نے دیکھا کہ اپنے لیے بہترین درس گاہ کا اِنتخاب کرنے والا محمّد علی اِنگلستان سے کامیاب و کامران لوٹا۔ اُس کی مُستقل مزاجی اور بلند حوصلے نے اُسے وہ درخشاں ستارہ بنا دیا جسے ہم قائدِ اعظم کے نام سے پُکارتے ہیں۔

سنہری چڑیا

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سنہری چڑیا نے کہا "پیارے بچو، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ نیکی کا بدلہ نیکی اور برائی کا بدلہ برائی ہوتا ہے، اس لئے ہر ایک سے نیکی کرنا اور برائی کسی سے نہ کرنا۔ آج میں اس بارے میں ایک سچی کہانی سناتی ہوں۔

یہ واقعہ لاہور کی ایک مشہور درگاہ کا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ درگاہ مُجاوروں کے قبضے میں تھی۔ اس درگاہ پر دور دور سے زائرین آتے اور خوب چڑھاوے چڑھاتے۔ یہ چڑھاوے سونے چاندی کے زیور، قیمتی کپڑوں اور نقدی کی صورت میں ہوتے۔ مُجاوروں کو ہر روز سینکڑوں روپے کی آمدن ہوتی۔ مفت کے مال و دولت سے وہ بد کردار اور سنگدل بن گئے۔ ان کی اولاد بھی ان کی طرح بد چلن نکلی۔ زائرین کو طرح طرح سے لُوٹنا ان کی عادت بن گئی۔ مگر ظلم ہر حال میں ظلم ہوتا ہے۔ ظالم کو اس کا بدلہ ایک نہ ایک دن ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ انہیں بھی ملا جو بڑا ہی عبرتناک تھا۔

ایک شام وہاں ایک پردیسی زائر آیا۔ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی تھا اور لاہور ایسے بڑے شہر سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کے پاس دو ہزار روپیہ تھا۔ اس زمانے میں روپے کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ آجکل کے حساب سے اس کے دو ہزار روپے ہمارے دو لاکھ روپے کے برابر تھے۔ رات پڑی تو اس دیہاتی نے بڑے مُجاور سے کہا کہ وہ رات درگاہ ہی میں بسر کرنا چاہتا ہے، کیونکہ شہر میں اس کا کوئی سنگی ساتھی ہے نہ رشتے دار۔ دوسرے اس کے پاس دو ہزار روپیہ بھی ہے جو یہاں آپ کی حفاظت میں چور اُچکّوں سے محفوظ رہے گا۔

مجاور نے دیہاتی کی بات سنی تو اس کی نیّت میں فتور آگیا۔ روپے کے لالچ نے اسے اندھا کر دیا۔ اس نے دیہاتی کو تسلّی دی، لنگر سے کھانا منگوا کر کھلایا اور اس کے سونے کا بندوبست کر دیا۔

اس درگاہ یا دربار کے احاطے میں ایک درجن کے قریب چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ان چارپائیوں پر اس بڑے مُجاور کے بیٹے اور پوتے سویا کرتے تھے۔ دیہاتی کے لئے اس نے آخری کونے والی چارپائی پر بستر کرا دیا اور اپنے دو بیٹوں کو جو نوجوان اور طاقتور تھے، اعتماد میں لے کر دیہاتی کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے بیٹے عیّاش اور مجرم تھے۔ وہ سینما دیکھنے چلے گئے، اور پردیسی اپنی چارپائی پر سو گیا۔ اتفاق سے آدھی رات کے وقت اسے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ وہ پیشاب کر کے لوٹا تو غلطی سے اپنی چارپائی کے بجائے ایک اور چارپائی پر چادر اوڑھ کر سو گیا اور اس کی چارپائی پر مجاور کا تیسرا بیٹا جو شراب کے نشے میں دھت تھا، چادر تان کر سو گیا۔

آدھی رات کے بعد بد نیّت و دغاباز مجاور کے بدمعاش بیٹے دربار کے احاطے میں آئے۔ منصوبے کے مطابق انہوں نے دیہاتی کی چارپائی پر چادر تانے اور اس میں منہ چھپائے اپنے بھائی کو دبوچ لیا۔ ایک بھائی نے اس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے نے اس کے سینے میں خنجر اُتار دیا۔ وہ اس وقت تک اس پر خنجر چلاتا رہا جب تک وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا نہ ہو گیا۔

اب سفّاک بھائیوں نے دیہاتی کے روپوں کی تھیلی لینے کے لئے مقتول کے منہ سے چادر ہٹائی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ وہ دیہاتی نہیں ان کا سگا بھائی تھا۔ انہوں نے سر پیٹ لیا۔ نعش پر چادر ڈال کر وہ اپنے دغاباز باپ کے پاس گئے اور اسے یہ ماجرا سنایا تو وہ صدمے سے پاگل ہو گیا۔ گھر میں

عورتوں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پڑوسی جاگ اٹھے۔ دربار میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس زمانے میں کوئی شخص قتل ہو جاتا تو سارا شہر لرز اٹھتا۔ پولیس فوراً حرکت میں آ جاتی اور قاتل یا قاتلوں کو فوراً گرفتار کر لیتی۔

پولیس کو اطلاع ملی تو وہ فوراً وہاں پہنچ گئی اور نعش کو قبضے میں کر کے تفتیش شروع کر دی۔ حُسنِ کارکردگی دیکھئے کہ اس نے چند گھنٹوں کے اندر اندر ملزموں کو گرفتار کر لیا۔ سارے شہر میں اس کا خوب چرچا ہوا۔ لوگ خوش تھے کہ بدمعاش مجاوِر آخر اپنے جرموں کی پاداش میں پکڑے گئے اور اب کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔

ملزموں کے خلاف مقدمہ چلا۔ مجاوروں نے رشوت سے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی، مگر اس عہد میں ایسے مقدموں میں رشوت نہیں چلتی تھی۔ عدالتِ عالیہ نے باپ کو عمر قید کی سزا دی اور تینوں بیٹوں کو سزائے موت دی۔

پیارے بچو! ان مجاوروں نے پہلے بھی گھناؤنے جرم کیے تھے۔ ان کو اپنے ظلم و جرم کی سزا ملنا تھی، سو مل گئی۔ اب میں تمہیں اس اجنبی دیہاتی کی بات بتاتی ہوں۔ وہ بڑا نیک اور صاحب دل تھا۔ گاؤں والوں کی مالی مدد بھی کرتا تھا اور ان کے کام بھی آتا تھا۔ ایک دفعہ خرکاروں نے اس کے گاؤں کا ایک لڑکا اٹھا لیا۔ وہ اسے گھوڑے پر بٹھا کر لے جا رہے تھے کہ لڑکے کا شور و غوغا سُن کر ہمارے بہادر دیہاتی نے خرکاروں کو للکارا۔ لیکن وہ بھاگ اٹھے۔ اس کے پکارنے پر چند گاؤں والے بھی آ گئے اور انہوں نے گھوڑوں پر بیٹھ کر ان کا تعاقب کیا۔ دو تین گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد گاؤں والوں نے خرکاروں کو جا لیا۔ لڑائی ہوئی، لاٹھیاں چلیں، خرکار زخمی ہوئے تو لڑکے کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ دیہاتی نے اس لڑکے کی جان بچائی تھی، یہ اس کی جزا تھی کہ ربِ رحمٰن نے اسے ظالم مجاوروں کے ہاتھوں سے بچا لیا۔

بچو! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ بُرائی کا بدلہ ہمیشہ بُرا اور بھلائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی ہوتا ہے۔"

بھُول بھُلّیاں

Sharjeel Ahmed

آئیے مسکرائیے

عورت (سبزی فروش سے): سبزی اچھی دینا۔ خراب ہوئی تو پکی پکائی تمہارے پاس لے آؤں گی۔

سبزی فروش: سبزی کے ساتھ دو روٹیاں بھی لیتی آنا۔

(محمد عمران نومی، عارف والا)

اُستاد (شاگرد سے): آج تم اِتنا موٹا موٹا کیوں لکھ رہے ہو؟

شاگرد: اِس لیے کہ آپ اپنا چشمہ منگوانے کے لیے مجھے اپنے گھر نہ بھیجیں۔ (شیخ طاہر مجید، راولپنڈی)

ایک گیدڑ نے دوسرے گیدڑ سے کہا، آؤ دوست، خربوزے کھانے چلیں۔ میں نے خربوزے کھانے کا پرمٹ لے لیا ہے۔

جب وہ خربوزے کے کھیت میں پہنچے تو کھیت کا مالک لاٹھی لے کر اُن کے پیچھے دوڑا۔ دوسرے گیدڑ نے پہلے گیدڑ سے کہا، اِسے پرمٹ دکھا دو۔ پہلا گیدڑ بولا "یہ آدمی اَن پڑھ ہے۔ بھاگو!" (صداقت حیات زخمی، لاوہ)

ایک شخص نے ایک فقیر سے کہا "کل تم لنگڑے بن کر مانگ رہے تھے۔ آج اندھے بن کر مانگ رہے ہو؟"

فقیر بولا "جناب، میں تجربہ کر رہا ہوں کہ بھیک کس طرح زیادہ ملتی ہے" (نغمانہ بشیر پشاور)

پہلا دوست: میں دس فٹ کے فاصلے سے شیر کو گولی مار سکتا ہوں۔

دوسرا دوست: یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ میں صرف ایک فٹ کے فاصلے سے شیر کی فوٹو کھینچ سکتا ہوں۔

پہلا دوست: جنگل میں؟

دوسرا دوست: نہیں۔ چڑیا گھر میں۔

(نام لکھنا بھول گئے)

ایک صاحب اپنے دوست کی سالگرہ کی دعوت میں گئے تو یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ کیک کے اُوپر موم بتیوں کی بجائے بجلی کا بلب رکھا ہُوا ہے۔ پوچھنے پر دوست نے بتایا کہ یہ میری ساٹھویں سالگرہ ہے۔ موم بتیاں بہت مہنگی ہیں اِس لیے میں نے کیک پر ساٹھ واٹ کا بلب رکھ دیا ہے۔

پہلا وکیل (دوسرے وکیل سے): تم نے میرے مُؤکّل کی حرکت دیکھی؟

دوسرا وکیل: کیوں؟ کیا ہوا؟

پہلا وکیل: میں نے اُسے جعلی نوٹوں کے مُقدّمے سے بَری کروایا اور وہ مجھے فیس میں بھی جعلی نوٹ دے گیا۔

اُستاد (شاگرد سے): سائنس کا کام مکمّل کر لیا؟

شاگرد: جی ہاں۔

اُستاد: اور حساب کا کام؟

شاگرد: وہ بھی مکمّل کر لیا۔

اُستاد: واہ! پھر تو تم کمال کے لڑکے ہو۔

شاگرد: نہیں سر۔ میں کمال کا نہیں، جمال کا لڑکا ہوں۔

(مریم محمود اختر، پیر محل)

ایک بچّہ گلی میں کھیل رہا تھا۔ سامنے والے مکان سے ایک کتّا نکلا اور اُس کے پاؤں چاٹنے لگا۔

بچّہ روتا ہوا گھر آیا تو ماں نے پوچھا "رو کیوں رہے ہو؟ کہیں پڑوسی کے کتّے نے تو نہیں کاٹ لیا؟"

بچّہ بولا "ابھی تو چکھ کر گیا ہے۔ کاٹنے تو کل آئے گا۔" (ثروت یعقوب، لاہور)۔

سردی آئی

امان اللہ نیرؔ شوکت

سردی چھم چھم کرتی آئی
سورج کی صورت کُملائی
سب کہتے ہیں گرمی جائے
سردی جلدی جلدی آئے
دِل کو سکُوں بخشے سردی
گرمی نے تو حد ہی کر دی
کھیلیں، بھاگیں اور دوڑیں گے
رات کو اب ہم خوب پڑھیں گے
میٹھی میٹھی نیند سُلائے
لمحہ لمحہ دل کو لُبھائے
کپڑے گرم ہمیں پہنائے
یا رب سردی کبھی نہ جائے
ہر دم خوش ہے اَب میرا دل
خوب جمے گی اب تو محفِل
اے پنکھوں کے موسم رُخصت
اب نہ پئیں گے ٹھنڈا شربت
چائے کا اب دَور چلے گا
یہ چکّر ہر طَور چلے گا
نیرؔ اب تُو کِشمِش کھا لے
چلغوزے سے دِل بہلا لے

وہ کون تھا؟

محمد یونس حسرت

میں اُس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ ہماری سیاہ رنگ کی گائے نے سفید دُودھیا رنگ کے ایک بچھڑے کو جنم دیا۔ تیسرے چوتھے روز دادا جان نے مجھے اپنے پاس بُلایا اور کہا "یہ بچھڑا تمہارا ہے، آج سے۔"

"اچھا!" میں نے خوشی سے بھرپُور نعرہ لگایا اور جا کر بچھڑے سے لپٹ گیا۔ اُس کے مُلائم مُلائم بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"اب اِس کے لیے گھاس بھی لایا کرنا" دادا جان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا" میں نے کہا "اِس کے لیے گھاس میں ہی لایا کروں گا۔ اور کوئی اس کے آگے گھاس نہ ڈالے۔"

اور یُوں ہنسی ہنسی میں ہی میں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں طالبِ علم سے گھسیارے کا رُوپ دھار لیا۔ میں صبح ہی صبح باسی روٹی تازہ مکھن کے ساتھ کھاتا، اُوپر سے ایک گلاس لسّی کا پیتا، ایک چھوٹا سا کھُرپا ہاتھ میں لیتا، اپنی چھوٹی سی چادر کاندھے پر ڈالتا اور گھاس کھودنے نکل جاتا۔ دوپہر سے خاصی دیر پہلے میں لوٹ آتا اور آتے ہی تمام گھاس اچھی طرح جھاڑ کر بچھڑے کے آگے ڈال دیتا۔

ہمارا گھر گاؤں کے بالکل سرے پر تھا۔ اُس سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک تالاب تھا جہاں بھیڑ بکریوں، بیلوں، گایوں بھینسوں اور دیگر جانوروں کو پانی پلایا جاتا تھا۔ گاؤں کے بچّے سارا سارا دن اِسی تالاب میں نہاتے اور چھلانگیں لگاتے۔ تالاب کے کنارے ایک پیپل کا درخت تھا۔ اُس کی کئی شاخیں تالاب کے اُوپر پھیلی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے برہمن اور دُوسری ذاتوں کے ہندو صبح ہی صبح اُس میں اشنان کرتے اور اپنی گڑوی سے بوڑھے پیپل دیوتا کی جڑوں میں پانی ڈالا کرتے وہ پیپل کو دیوتا مانتے تھے اور اُس کی ٹہنی تو رہی ایک طرف پتّا توڑنا بھی گُناہ خیال کرتے تھے۔ مگر مسلمانوں اور اُن کے لڑکوں کا معمول کچھ اور تھا۔ وہ جب اپنے ڈھور ڈنگروں کو پانی پلانے کے لیے تالاب پر لاتے تو جانوروں کو پانی پلانے اور نہلانے کے ساتھ خود بھی نہاتے۔ مگر اُن کا نہانا ہندوؤں کی طرح سیدھا سادہ نہانا نہیں ہوتا تھا کہ کپڑے اُتار کر تالاب میں دو ایک غوطے لگا لیے اور بس۔ وہ تو اپنے ڈھور ڈنگروں

کی پیٹھ پر بیٹھ کر آتے، اُچھل کر پیپل کی کوئی ٹہنی پکڑ لیتے اور پھر اُس ٹہنی سے تالاب میں چھلانگ لگاتے۔

میرا معمول بھی کچھ ایسا ہی تھا بلکہ اِس سے کچھ بڑھ کر۔ میں جب گائے اور بچھڑے کو تالاب پر لاتا تو اُس وقت تو تالاب میں صرف ایک دو غوطے ہی لگاتا مگر گائے اور بچھڑے کو گھر واپس لے جانے اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد دوبارہ تالاب پر آ جاتا اور پیپل کی ٹہنیوں پر چڑھ کر تالاب میں چھلانگیں لگاتا رہتا۔ سیدھی قلابازی تو میرے لیے معمولی بات تھی ہی، مجھے اُلٹی قلابازی لگانے کی بھی خاصی مہارت ہو گئی تھی۔

میری طرح گاؤں کے کئی اور لڑکے بھی دوپہر کے وقت وہاں آ جاتے۔ ایسے میں ہم تالاب کے کنارے پیپل کے درخت اور اُس کے قریب دوسرے درختوں کی ٹہنیوں پر بندروں کی طرح پُھدکتے ہوئے "پیپل پلانگڑا" کھیلا کرتے۔ اِس کھیل میں ایک لڑکا کسی درخت کی ٹہنی کے نیچے دائرہ لگا کر اُس کے اندر ایک ڈنڈا رکھ دیتا۔ باقی لڑکے درختوں کی ٹہنیوں پر چڑھ جاتے۔ وہ لڑکا کسی ٹہنی پر چڑھ کر کسی لڑکے کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا۔ لڑکے کو ہاتھ لگانے کے بعد وہ تیزی کے ساتھ نیچے اُترتا اور دائرے میں پڑے ہوئے ڈنڈے کو اُٹھا کر اُسے اپنی ایک ٹانگ کے نیچے سے دور پھینک دیتا۔ اِس کے بعد وہ خود کسی درخت کی ٹہنی پر چڑھ جاتا اور جس لڑکے کو اُس نے ہاتھ لگایا تھا، وہ ڈنڈا اُٹھا کر لاتا اور اُسے دائرے میں رکھنے کے بعد درخت پر چڑھے ہوئے کسی لڑکے کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا ــــ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ اُس سے پہلے ہی کوئی لڑکا نیچے اُتر کر ڈنڈا دُور پھینک دیتا اور اُسے ڈنڈا لا کر دائرے میں رکھنے کے بعد پھر کسی کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرنی پڑتی۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی لڑکا جان بُوجھ کر ڈنڈا تالاب میں پھینک دیتا اور اِس کے بعد ہمارا کھیل تالاب کے کنارے سے تالاب کے پانی میں منتقل ہو جاتا۔ لڑکے اِرد گِرد کے درختوں سے ہٹ کر تالاب کے کنارے کے پیپل کی ٹہنیوں پر آ جاتے اور دیر تک تالاب میں چھلانگیں لگاتے رہتے۔

پھر ایک دوپہر کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا خیال آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جس کی ایک ایک تفصیل 50 سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود میرے ذہن میں اِس طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔

اُس روز میں اپنے بچھڑے کے لیے گھاس کی تلاش میں خاصی دور نکل گیا تھا اور جب واپس آیا تو میرا بچھڑا دادا جان کی لائی ہوئی گھاس سے اپنا پیٹ بھر چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دادا جان خود ہی گائے اور بچھڑے کو تالاب پر لے جا کر پانی پلا چکے تھے۔

اور جب میں تالاب پر پہنچا تو وہ بھی سُنسان پڑا تھا۔ نہ درختوں پر پیپل پلانگڑا کھیلنے والے لڑکے تھے اور نہ کوئی گائے بھینس یا بھیڑ بکری ہی تھی۔ تالاب کو اِس سُنسان حالت میں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے خوف سا محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے کپڑے اُتارے، دائیں ہاتھ کو پُوری قوّت سے لہراتے ہوئے ڈانڈا پانی میں پھینکا اور پھر پانی میں چھلانگ لگا کر اُس طرف بڑھنے لگا جہاں ڈنڈا گرا تھا۔ میں نے یہ اِرادہ کر لیا تھا کہ آج میں اکیلا ہی یہ کھیل کھیلوں گا، خود ہی ڈنڈا پانی میں پھینکوں گا اور پھر خود ہی اُس تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

میں تالاب کے درمیان میں پہنچا ہی تھا کہ ایک لڑکا تیزی سے تیرتا ہُوا میرے قریب سے گزرا اور ذرا سی دیر میں ڈنڈے تک جا پہنچا۔ اُس نے ڈنڈا ہاتھ میں لیا، ہاتھ کو بلند کیا اور پھر اُسے زور سے دوسری طرف پھینک کر میری طرف دیکھتے ہوئے چلّایا "آؤ!"

میں حیران رہ گیا، کیوں کہ جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے اِس لڑکے کو تالاب کے پاس بالکل نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے پانی میں کُودنے کی آواز بھی مجھے سُنائی نہیں دی تھی۔ خدا جانے وہ کدھر سے آیا اور کب آیا اور کب اور کس طرح تیرتے ہوئے مجھ سے آگے نکل گیا تھا!

وہ "آؤ!" کا نعرہ لگا کر اُس طرف لپکا جہاں ڈنڈا گرا تھا۔ میں نے بھی اُدھر کا رُخ کیا۔ لیکن میرے پہنچنے سے پہلے

ہی وہ وہاں جا پہنچا اور اُس نے "پھر آؤ!" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈنڈا دوسری طرف پھینک دیا۔

کوئی پندرہ منٹ تک ہمارے درمیان یہ کھیل جاری رہا۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی اور اپنے آپ پر غصّہ بھی آ رہا تھا۔ آج تک اِس کھیل میں گاؤں کا کوئی لڑکا مجھ سے بازی نہیں لے جا سکا تھا، اور یہ لڑکا تھا کہ مجھے بار بار مات دیے جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ تک مُسلسل ہارتے رہنے کے بعد آخر مجھے جیتنے کا موقع ملا۔ میں اُس سے پہلے ڈنڈے تک جا پہنچا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈنڈا پکڑا اور پوری قُوّت سے اُسے تالاب کے باہر پھینک دیا۔ اِس کے ساتھ ہی کھیل ختم ہو گیا۔ میں اگرچہ جیت گیا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے بار بار اِحساس ہو رہا تھا کہ میں اپنی قُوّت کے بَل پر نہیں جیتا بلکہ اُس لڑکے نے جان بُوجھ کر اپنی رفتار آہستہ کر کے مجھے جیتنے کا موقع دیا تھا۔

جب کھیل ختم ہوا اور ہم تالاب سے باہر نکل آئے تب میں نے پہلی بار اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ تقریباً میرا ہم عُمر تھا۔ اُس کا جسم بھی میری طرح دُبلا پتلا اور پُھرتیلا تھا۔ اور بازو بھی میرے بازوؤں کی طرح لمبے لمبے تھے۔ فرق کچھ تھا تو رنگت اور سر کے بالوں کا تھا۔ میرا رنگ گندمی تھا اور وہ انگریزوں کی طرح گورا چٹّا تھا۔ میرا سر گاؤں کے دوسرے لڑکوں کی طرح مُنڈا ہُوا تھا اور اُس کے سر پر انگریزی فیشن کے بال تھے۔

تھوڑی دیر ہم تالاب کے کنارے بیٹھے اپنے پُھولے ہُوئے سانس دُرست کرتے رہے۔ اور جب میرا سانس کچھ دُرست ہُوا تو میں نے بات شروع کرنے کی غرض سے کہا "میں نے اِس سے پہلے چوہلٹہ میں تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آئے ہو تم؟"

"کھرڑ سے" اُس نے جواب دیا۔

چوہلٹہ میرے گاؤں کا نام تھا اور اُس سے پانچ میل کے فاصلے پر کھرڑ کا قصبہ تھا۔ کھرڑ ضلع انبالہ (بھارت، مشرقی پنجاب) کی تحصیل بھی تھی اور یہیں وہ کرسچن ہائی اسکول تھا جہاں میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اُس لڑکے کی زبان سے کھرڑ کا نام سُن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے کہا:

"میں کھرڑ کے کرسچن ہائی اِسکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ میرے والد شاہ نواز خان نے بھی اِسی اِسکول سے دسویں پاس کی تھی، اور آج کل وہ کھرڑ ہی کے ڈاک خانے میں تار بابُو لگے ہوئے ہیں۔ تم کون سی جماعت میں ہو اور کس اِسکول میں پڑھتے ہو؟"

"میں ساتویں میں ہُوں اور خالصہ اِسکول میں پڑھتا ہُوں۔ ماسٹر محمّد حُسین میرے اِنچارج ہیں۔ وہ بڈالی کے ہیں اور شکار سے دلچسپی رکھنے کی وجہ سے حُسینا شکاری کے نام سے مشہور ہیں۔"

بڈالی کھرڑ اور چوہلٹہ کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم اِسکول سے واپس گاؤں کی طرف آتے تو بڈالی کے

کسی کنوئیں سے ٹھنڈا پانی پی کر آگے بڑھتے تھے۔

"میرا نام یونس ہے" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "وہ سامنے، یہاں سے کوئی سو گز کے فاصلے پر، گاؤں کا پہلا مکان دکھائی دے رہا ہے نا، وہ ہمارا گھر ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں گا۔ دادا جان تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ میں تمہیں وہ سفید دُودھیا رنگ کا بچھڑا بھی دکھاؤں گا جو ہماری سیاہ رنگ کی گائے نے دیا ہے اور جسے دادا جان نے میرے نام کر دیا ہے۔ میں اُس کے لیے گھاس بھی خود ہی لاتا ہوں۔"

پھر میں نے اس لڑکے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟ تم کہاں رہتے ہو؟"

"میرا نام اَبرار حُسین ہے، سیّد اَبرار حُسین۔ میں کھرڑ میں سیّدوں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ میرے والد کا نام سیّد بشیر حُسین ہے۔ وہ دِلّی سے ایس۔ پی کے عُہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں اور اب کھرڑ ہی میں دفعہ 30 کے آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ سارا علاقہ اُنھیں سلام کرتا ہے۔ ہماری حویلی کے سامنے بڑ کا ایک بڑا سا درخت ہے جس کی شاخوں میں ہم اکثر پیپل پالنگڑا کھیلا کرتے ہیں۔"

دفعہ 30 کیا ہوتی ہے اور آنریری مجسٹریٹ کسے کہتے ہیں، ایس۔ پی کس بلا کا نام ہے اور عُہدے سے ریٹائرڈ ہونے کا مطلب کیا ہے، یہ ساری باتیں میری سمجھ سے بالکل باہر تھیں مگر میں اِتنا ضرور سمجھ گیا کہ یہ لڑکا کسی بہُت ہی اُونچے گھرانے کا ہے اور اِس کا باپ بہُت بڑا افسر ہے۔ اُس کے مقابلے میں تو میں کچھ بھی نہ تھا۔ کہاں ایک معمولی سے کسان کا پوتا اور ایک چھوٹے سے کلرک کا بیٹا اور کہاں ایک ریٹائرڈ ایس۔ پی اور آنریری مجسٹریٹ کا بیٹا ___ مجھ پر تو اُس کی باتوں کا منوں رُعب پڑ گیا اور میں سوچنے لگا کہ اِتنے بڑے گھر کے بیٹے کو میں اپنے معمولی سے گھر میں لے جا کر کیا دکھاؤں گا؟ سیاہ رنگ کی گائے کا سفید دُودھیا رنگ کا بچھڑا بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ آنریری مجسٹریٹ کے بیٹے کو فخر سے دکھائی جا سکے ___ اِس کے باپ کی حویلی میں تو ایسی نہ جانے کتنی گائیں ہوں گی، کتنے بچھڑے ہوں گے۔ اِس کے علاوہ نہ جانے کتنی بھینسیں اور گھوڑے گھوڑیاں ہوں گی۔

پھر میں نے جیسے اپنی شرمندگی مٹانے اور باتوں کا رُخ کسی اور طرف موڑنے کی غرض سے کہا "آؤ، چل کے اِس پیپل کی شاخوں پر سے تالاب میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔"

"تم ہی لگاؤ" اُس نے اِشارے سے کہا۔

میں سینہ تان کر پیپل کی طرف بڑھا۔ یکایک میرے دل میں یہ اِحساس پیدا ہُوا کہ اَبرار حُسین نام کا یہ لڑکا تیرنے میں تو مجھے مات دے گیا ہے مگر بلندی پر سے پانی میں چھلانگ لگانے سے ڈرتا ہے۔ اِس لحاظ سے کم از کم یہ کام ضرور ایسا ہے جس میں مجھے اِس پر اپنی برتری ثابت کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔

یہ اِحساس اپنے دل میں بسائے میں پیپل کی اُس سب سے بڑی شاخ پر جا پہنچا جو تالاب کے پانی پر جھکی ہوئی شاخوں میں

سب سے اُونچی تھی۔ اُس شاخ پر سے میں نے تالاب میں تین چار چھلانگیں لگائیں۔ ہر چھلانگ لگانے کے بعد میں داد طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا اور اُسے اشارے سے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیتا۔ لیکن وہ اشارے ہی سے انکار کر دیتا تھا مگر ایک ایسی مُسکراہٹ کے ساتھ جس میں میرے لیے تعریف ہی تعریف ہوتی تھی۔

تین چار سیدھی سادی چھلانگیں لگانے کے بعد میں نے ابرار حُسین پر اپنی مہارت کا مزید رُعب ڈالنے کے لیے قلا بازی لگاتے ہوئے دو تین چھلانگیں بڑی کامیابی سے لگائیں اور پھر ابرار حُسین کی طرف دیکھا۔ اب اُس کے چہرے پر حیرت بھری تعریف کا تاثّر تو تھا مگر مسکراہٹ بالکل نہیں تھی۔ میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ اِس پر میری مہارت کا اچھا خاصا رُعب پڑا ہے۔

ایک ایک قلابازی کے ساتھ دو چھلانگیں لگانے کے بعد میں نے دو قلابازیاں لگا کر پانی میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اُچھل کر ایک قلابازی لگائی اور جب دوسری قلابازی لگا کر نیچے پانی کی طرف گیا تو پٹاخ کی آواز آئی اور اِس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی ٹھوس چیز میرے سر کے پچھلے حصّے سے بڑے زور سے ٹکرائی۔ چوٹ اِتنی سخت تھی کہ میرے کندھے اور اُن کے ساتھ ہی بازو خود بخود سُکڑ گئے۔ یُوں لگتا تھا جیسے میں ایک بھاری پتّھر کی طرح تالاب کی تہ میں بیٹھا جا رہا ہوں۔ میں اپنے بازوؤں کو ہِلا جُلا نہیں سکتا تھا اور مجھے اپنی ٹانگیں ڈھائی من کی بوری کی طرح بھاری معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے چیخنے کے لیے مُنہ کھولا تو تالاب کا کڑوا کسیلا پانی میرے مُنہ میں بھر گیا۔ ایک زبردست خوف نے میرے سارے وجود کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ میں نے آج تک پانی یا کسی اور چیز سے اتنا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔

پھر اچانک مجھے اپنے سامنے ابرار حُسین کا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس نے میری کلائیوں کو مضبوطی سے تھاما اور مجھے اُوپر کی طرف کھینچا۔ اِس کے ساتھ ہی درد کی شِدّت سے شاید میری آنکھیں بند ہو گئیں کیونکہ اِس کے بعد میں نے ابرار حسین کو

دوبارہ نہیں دیکھا۔

میں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں اپنے گھر کے باہر نیم کے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر پڑا تھا اور دادا جان مجھ پر جُھکے ہُوئے فِکر بھری نِگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"آرام سے لیٹے رہو ـــ بولنے یا ہِلنے جُلنے کی کوشش نہ کرو۔ تمھاری حالت خاصی خراب ہے؟"

میں نے دادا جان کے اُلفاظ سُن کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میرے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا ہے۔ میرا ہاتھ بے اِختیار سری طرف گیا۔ وہاں ایک پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اُبرار حُسین!"

کوئی جواب نہ پا کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کہا "اَبرار حُسین کہاں ہے، دادا جان؟"

"اَبرار حسین؟ کون اَبرار حسین؟" داد جان نے گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "وہی لڑکا جو تالاب پر میرے ساتھ تھا۔ ہم تالاب میں اکٹھے تیر رہے تھے۔"

"تم تو وہاں اکیلے ہی تھے، بیٹے" دادا جان نے کہا "کالُو ترکھان کھرڑ کسی کام سے گیا تھا۔ وہ واپس آتے ہوئے تالاب کے پاس سے گزرا تھا۔ وہی تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ تم اکیلے ہی تیر رہے تھے اور اپنے آپ ہی سے باتیں کر رہے تھے ـــ میرا خیال ہے تم وہاں اکیلے ہی کوئی کھیل کھیل رہے ہو گے۔"

"میں اور اَبرار حُسین اکٹھے کھیل ....." میں نے کہنا چاہا مگر اُنہوں نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"آرام سے لیٹے رہو اور باتیں کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا سر پیپل کی بڑی ٹہنی سے ٹکرایا تھا اور سر میں بڑی سخت چوٹ لگی ہے۔"

کئی دن تک میری چوٹ کا عِلاج ہوتا رہا۔ غالباً دُوسری قلابازی لگاتے ہوئے میں پیپل کی شاخ اور تالاب کے پانی کا دُرست اندازہ نہیں کر سکا تھا اور میرا سر پیپل کی شاخ سے جا ٹکرایا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کھرڑ سے ڈاکٹر فِدا حُسین آتے اور میری مرہم پٹّی کر جاتے اِنہوں نے کھرڑ میں سیّدوں کی حویلی ہی کی ایک دُکان میں اپنا دواخانہ قائم کر رکھا تھا۔

یہ بات مجھے دادا جان نے ایک روز ڈاکٹر فِدا حُسین کے جانے کے بعد بتائی تھی۔ اگلی مرتبہ جب وہ میری مرہم پٹّی کرنے آئے تو میں نے اُن سے اَبرار حُسین کا ذکر کیا۔ وہ میری بات سُن کر کہنے لگے "جہاں تک مجھے عِلم ہے۔ سیّد بشیر حُسین کا کوئی بیٹا ایسا نہیں جو تمہارا ہم عُمر ہو۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ اِن دنوں اُن کا کوئی نواسا اُن کے ہاں آیا ہوا ہو یا اُن کے کوئی اور دُور پار کے عزیز آئے ہوئے ہوں اور اُن میں کوئی بچّہ تمہاری عُمر کا ہو۔"

"اَبرار حُسین نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ساتویں جماعت میں ہے، خالصہ اِسکول میں پڑھتا ہے اور ماسٹر محمّد حُسین اُس کے اِنچارج ہیں۔"

"ماسٹر محمّد حُسین؟" ڈاکٹر فِدا حُسین نے کہا "حُسینا شِکاری؟"

"جی ہاں۔"

"اُنہیں تو ریٹائرڈ ہوئے مُدّت ہو گئی" ڈاکٹر فِدا حُسین بولے۔

مجھے اِس جواب کی نہ تو توقّع تھی اور نہ یہ جواب میری سمجھ میں ہی آیا تھا۔ مگر اِس سے میرا ذہن اُلجھ کر رہ گیا اور میں اِس اُلجھاؤ میں اُلجھ کر خاموش ہو گیا۔

جب میرے سر کا زخم پوری طرح ٹھیک ہو گیا تو میں نے کھرڑ کا رُخ کیا تاکہ سیّدوں کی حویلی میں جا کر اپنے اُس مُحسن کا شکریہ ادا کر سکوں جس کا نام اَبرار حُسین تھا اور جس نے مجھے تالاب میں ڈوبنے اور بے موت مرنے سے بچایا تھا۔

مگر جب میں بڈالی سے گزر رہا تھا تو میرے دماغ میں ماسٹر محمّد حُسین کا نام گونج اُٹھا ـــ اِس کے ساتھ ہی میرے قدم خود بخود رُک گئے۔ بڈالی کی حدُود میں داخل ہونے کے بعد جو پہلا شخص مجھے مِلا، اُس سے میں نے حُسینا شکاری کے مُتعلق دریافت کیا۔

"کیا آپ مجھے حُسینا شکاری سے مِلوا سکتے ہیں؟"

اُس شخص نے یہ سوال سُن کر میری طرف یُوں حیرانی سے دیکھا جیسے وہ مجھے پاگل سمجھ رہا ہو۔ میں نے کہا "کیا بات ہے؟ آپ مجھے یُوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

"اِس لیے کہ تم جِن صاحِب سے ملنا چاہتے ہو، اُنہیں اِس دُنیا سے رُخصت ہوئے 25 سال ہو گئے ہیں۔ وہ خان بہادُر سیّد بشیر حُسین کے ساتھ شکار کھیلنے گئے تھے اور ایک مچان سے گر کر ایک آدم خور شیر کا لقمہ بن گئے تھے۔"

مجھے یہ سُن کر دُکھ تو ہُوا ہی لیکن اِس سے میرا ذہن جو پہلے ہی اُلجھا ہُوا تھا، کچھ اور اُلجھ گیا۔ ڈاکٹر فِدا حُسین نے تو صرف یہی

بتایا تھا کہ انہیں ریٹائرڈ ہوئے مدّت ہو گئی ہے مگر بڈالی میں آ کر معلوم ہوا کہ وہ پچیس سال پہلے اِس دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ میں نے اُس شخص کی بات سُن کر جواب میں کچھ نہیں کہا اور نہ کچھ پوچھا بلکہ خاموشی سے کھرڑ کی طرف بڑھ گیا۔

کھرڑ میں سیّدوں کی بڑی حویلی اِس حد تک ضرور میری دیکھی بھالی تھی کہ اِسکول جاتے ہوئے ہمارا گزر روز اِسی حویلی کے سامنے سے ہوتا تھا۔ مگر اِس حویلی کے مُتعلّق کچھ جاننے یا اُس کے اندر جانے کی خواہش ہمارے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے گاؤں سے کوئی درجن بھر لڑکے اِسکول جاتے تھے اور چُپ چاپ اس حویلی کے پاس سے گُزر جاتے تھے۔

مگر اب اِسکول نہیں، سیّدوں کی بڑی حویلی میری منزل تھی۔ مجھے اُس کے سامنے سے چُپ چاپ نہیں گزرنا تھا بلکہ اُس کے اندر جانا تھا اور اندر جا کر اُس اَبرار حُسین کا شکریہ ادا کرنا تھا جس نے عین موقع پر مجھے موت کے مُنہ میں جانے سے بچایا تھا۔

سیّدوں کی بڑی حویلی اچھا خاصا قلعہ معلوم ہوتی تھی اور اُس کا پھاٹک بھی کسی مضبوط سے مضبوط قلعے کے مضبوط سے مضبوط دروازے سے کم نہ تھا۔ مگر عام قلعوں کے اُلٹ اُس حویلی کے دروازے پر کوئی مُسلّح یا غیر مسلّح پہرے دار یا چوکیدار موجود نہ تھا۔ اصل دروازہ تو بند تھا مگر اُس کے ایک پٹ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کُھلی تھی۔ میں اللہ کا نام لے کر اُس کھڑکی کے راستے حویلی میں داخل ہو گیا۔

حویلی میں داخل ہوتے ہیں سامنے نِگاہ کی تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر اُبرار حُسین نیم کے ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا ہے۔ میں ایک دم بازو پھیلا کر اُس کی طرف لپکا "اَبرار حُسین! اَبرار حُسین؟"

مگر نیم کے درخت سے چند گز کے فاصلے پر ہی میرے قدم رُک گئے۔ وہ لڑکا اَبرار حُسین نہیں، کوئی اور تھا۔ میں حیرانی اور بے یقینی کی مِلی جُلی کیفیت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کس سے ملنا ہے؟" لڑکے کی آواز میرے کانوں میں جیسے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

"اَبرار حُسین سے" میں نے جواب دیا "اُس نے مجھے تالاب میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ میں اُس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہُوں۔"

"یہاں کوئی اَبرار حُسین نہیں رہتا" لڑکے نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"کیا یہ خان بہادُر سیّد بشیر حُسین کی حویلی نہیں ہے؟"

"ہے" لڑکے نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ کیا بات ہوئی کہ یہاں کوئی اَبرار حُسین نہیں رہتا؟ اُس لڑکے نے مجھے یہی بتایا تھا کہ کھرڑ میں جو سیّدوں کی بڑی حویلی ہے، میں وہاں رہتا ہُوں اور میرے والد کا نام سیّد بشیر حسین ہے۔"

"کیا بات ہے، بیٹا؟" لڑکے کے پیچھے سے ایک خاتون کی آواز آئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ اَدھیڑ عُمر کی ایک عورت تھی۔ اُس نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیا بات ہے، عظیم؟ کون ہے یہ لڑکا، اور کیا چاہتا ہے؟"

"میں خان بہادُر سیّد بشیر حُسین کے بیٹے اَبرار حسین سے ملنے آیا ہُوں" میں نے جلدی سے کہا "وہ میرا مُحسن ہے۔ اُس نے مجھے تالاب میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ میں اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہُوں۔"

خاتون نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے کچھ پھیل سی گئی تھیں۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے میری طرف دیکھنے کے بعد وہ کہنے لگی "یہ تم چو بلیٹے کے تالاب کی بات کر رہے ہو بیٹا؟" ـــــ "جی ہاں۔"

خاتون پھر خاموش ہو گئی۔ خاصی دیر تک خاموش رہنے کے بعد جب اُس کی زبان کُھلی تو مجھے اُس کی آواز کہیں دُور، بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"خان بہادُر بشیر حُسین مدّت ہُوئی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اُن کے مرنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اُن کا بیٹا اَبرار حُسین بھی تمہارے چو بلیٹے کے تالاب میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ وہ خالصہ اسکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اُسے

پانی میں تیرنے اور چھلانگیں لگانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ پھر ایک بار ایسا ہوا کہ اُس پیپل کی ایک موٹی سی ٹہنی سے اُس کا سر ٹکرا گیا جس پر چڑھ کر وہ پانی میں چھلانگیں لگایا کرتا تھا۔ ٹہنی سے ٹکرا کر اُس کا سر پھٹ گیا اور پانی میں گرتے ہی اُس کی جان نکل گئی۔ جب سے آج تک وہ کئی دفعہ تالاب پر نمودار ہُوا ہے اور اُس نے کتنے ہی لڑکوں کی جان بچائی ہے۔ رہے نام اللہ کا!"

آخری الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہوتے اُس خاتون کی آواز بھرّا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ پھر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اُس کی تصویر دکھاؤں۔"

مگر خاتون کی باتیں سُن کر مجھ پر ایسا خوف چھایا کہ میں اُس کے ساتھ اندر جانے اور اَبرار حُسین کی تصویر دیکھنے کی بجائے چیخ مار کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہُوا اور پھر حویلی کے پھاٹک کی کھڑکی سے باہر نکل کر جو دوڑ لگائی ہے تو سیدھا اپنے گھر کے سامنے نیم کے درخت کے نیچے پہنچ کر دم لیا۔

دادا جان نیم کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھے حقّے کے کش لگا رہے تھے۔ میں بے دم سا ہو کر اُن کی آغوش میں جا گرا۔

"کہاں سے آ رہے ہو، بیٹا؟" اُنھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"کھڑ سے؟"

دادا جان نے حیران ہو کر کہا "تمہارے اِسکول میں تو چھٹّیاں ہیں، گرمیوں کی۔ وہاں کہاں گئے تھے؟"

"سیّدوں کی حویلی میں" میں نے جواب دیا۔

"اَبرار حُسین سے ملنے گئے ہو گے" دادا جان نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" میں نے پھُولا ہُوا سانس دُرست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو مِل آئے اُس سے؟" دادا جان نے ویسی ہی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ وہاں نہیں رہتا" میں نے کہا "اب وہ وہاں نہیں رہتا۔"

اور پھر میں ایک دم دادا جان سے یُوں چمٹ گیا جیسے کوئی بچّہ خواب میں ڈر جانے کے بعد اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے!

تلاش کیجیے

ننھّی ماریہ کی سہیلی فوزیہ جنگل میں کھو گئی ہے۔ کیا آپ اُسے تلاش کر سکتے ہیں؟ دائیں بائیں، اُوپر نیچے، چاروں طرف سے دیکھیے۔

دُوربین کے بعد

ذرا ایسی "جگہ" کا تصوّر کیجیے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جس کی نہ کوئی اِبتدا ہے نہ اِنتہا۔ اور جو (سائنس دانوں کے بقول) ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ کائنات ہے۔ سورج، سیّارے اور ستارے اسی کائنات کا حصّہ ہیں۔

پچھلے مہینے ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ پُرانے زمانے کے سائنس دانوں کے پاس نہ تو دُور بینیں تھیں اور نہ دوسرے سائنسی آلات۔ اُنھوں نے کائنات کے بارے میں لوگوں کو جو باتیں بتائیں، اُن میں سے چند صحیح تھیں اور باقی ساری غلط۔ آج کل کے سائنس دان کائنات کے متعلق اکثر باتیں ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں، کیوں کہ اِن کے پاس بڑی بڑی دور بینیں اور بڑے بڑے سائنسی آلات ہیں۔ لہٰذا مُستند ہے اِن کا فرمایا ہُوا۔

پُرانے زمانے کے جن سائنس دانوں نے کائنات کے بارے میں کچھ صحیح باتیں بتائی تھیں، ان میں کوپرنیکس کا نام سب سے اُوپر ہے۔ یہ سائنس دان 1473ء میں یورپ کے ایک ملک پولینڈ میں پیدا ہُوا۔ اُسے بچپن ہی سے فلکیات (چاند ستاروں کے علم) سے دلچسپی تھی۔ اُس کے زمانے میں لوگ ایک پُرانے فلسفی ٹالمی (جسے عرب بطلیموس کہتے ہیں) کی اِس بات کو مانتے تھے کہ زمین کائنات کا مرکز (سینٹر) ہے اور سُورج، چاند، ستارے اور سیّارے زمین کے گِرد گھومتے ہیں۔

لیکن کوپرنیکس کو ٹالمی کی اِس بات کا یقین نہ آیا۔ اُس نے دوسرے سائنس دانوں کی کتابیں بھی پڑھیں۔ اُن میں قدیم زمانے کا ایک یُونانی فلسفی "ارس ٹارکس" بھی تھا، جس نے ٹالمی سے 500 سال پہلے دُنیا والوں کو بتایا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے۔ یہ بات کوپرنیکس کے دل کو لگی اور اُس نے کئی سال کے غور و فکر کے بعد معلوم کیا کہ ارس ٹارکس ٹھیک کہتا تھا۔ زمین بھی مریخ (مارس)، زُہرہ (وینس) عطارد (مرکری) اور دوسرے سیّاروں کی طرح ایک سیّارہ ہے۔ یہ سب سیّارے سورج کے گِرد گردش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے کوپرنیکس ہی نے یہ بات بتائی کہ زمین کی دو گردشیں ہیں۔ ایک محوری گردش، جس میں زمین اپنے محور یعنی دُھرے (Axis) پر گھومتی ہے اور جس سے دن

رات بنتے ہیں، اور دوسری دَوری گردش، جس میں زمین سورج کے گِرد چکّر لگاتی ہے اور ایک سال میں اپنا چکّر پورا کرتی ہے۔ اِس چکّر سے مُختلِف موسم (خزاں، جاڑا، بہار اور گرمی) پیدا ہوتے ہیں۔

کوپرنیکس کے تقریباً سو سال بعد وہ مشہور سائنس دان پیدا ہُوا جس کو جدید سائنس کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ اُس کا نام "گیلیلیو گیلیلی" تھا۔

گیلیلیو 1564ء میں یورپ کے ایک ملک اٹلی کے شہر پیسا میں پیدا ہوا۔ وہ دوربین کا مُوجِد تو نہ تھا لیکن دُنیا کا پہلا شخص تھا جس نے دوربین کو چاند ستاروں کی چھان بین کے لیے اِستعمال کیا۔

گیلیلیو نے دوربین سے چاند کو دیکھا تو اُس کی سطح اونچی نیچی نظر آئی۔ اِسی دُوربین کی مدد سے اُس نے چاند کا سب سے پہلا نقشہ تیّار کیا۔ اُس نے دریافت کیا کہ سیّارہ جوپیٹر کے پانچ چاند ہیں جو اُس کے گرد گردِش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اُسی نے سیّارہ سیٹرن کے گِرد ہالہ دیکھا۔ مگر اُس کی دوربین چُوں کہ اِتنی طاقت وَر نہ تھی، اِس لیے اُسے ہالے کی بجائے دو کان نظر آئے جو سیٹرن کے دونوں جانب نکلے ہوئے تھے۔

جُوں جُوں گیلیلیو کائنات کا مُشاہدہ کرتا گیا، اُسے کوپرنیکس کی باتوں کا یقین ہوتا گیا۔ اُس زمانے کے پادری کوپرنیکس کو کافر کہتے تھے کیوں کہ اُس نے ایسی باتیں کہی تھیں جو مذہب کے خلاف تھیں۔ گیلیلیو نے کوپرنیکس کی باتوں کی تصدیق کی تو عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری پوپ نے اُس کے خلاف کُفر کا فتویٰ دے دیا اور بے چارے گیلیلیو کو اپنی عُمر کا آخری حصّہ قید خانے کی تنگ اور تاریک کوٹھڑی میں بسر کرنا پڑا۔

گیلیلیو ہی کے زمانے میں جرمنی میں ایک اور سائنس دان پیدا ہوا جس کا نام جوہن کیپلر تھا۔ اُس نے بھی کوپرنیکس کی باتوں کی تصدیق کی۔ کیپلر نے سیّاروں کی گردش کا مُشاہدہ کر کے بتایا کہ تمام سیّارے خاص راستوں پر سُورج کے گِرد گھومتے ہیں (اِن راستوں کو "مدار" (Orbit) کہا جاتا ہے) لیکن سیّاروں کے یہ راستے یا مدار بالکل گول نہیں ہیں۔ کیپلر ہی نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ جو سیّارہ سورج سے جتنا نزدیک ہو گا، اُتنی ہی تیزی سے سُورج کے گِرد گردش کرے گا۔

سورج کے نو سیّارے ہیں: عطارد (مرکری)، زُہرہ (وینس) زمین (جس پر ہماری دُنیا آباد ہے)، مِرّیخ (مارس)، مُشتری (جوپیٹر)، زُحل (سیٹرن)، یُورے نَس، نیپ چُون اور پلوٹو۔ اِن میں عطارد سورج کے سب سے زیادہ نزدیک ہے، اس لیے یہ سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ یہ اپنے مدار پر سورج کے گِرد 88 دن میں ایک چکّر پورا کرتا ہے۔ پلوٹو سب سے دُور (آخری سِرے پر) ہے، اِس لیے اِس کی رفتار بہت سُست ہے۔ یہ اپنے مدار پر سُورج کے گِرد 247 سال اور 225 دن میں ایک چکّر پورا کرتا ہے۔

لیکن ایک بات ایسی تھی جس کے مُتعلّق کیپلر ٹھیک ٹھیک نہ بتا سکا۔ وہ کون سی طاقت ہے جو سیّاروں کو سورج کے گرد گھُما رہی ہے؟ اِس بات کا جواب 78 سال بعد ایک انگریز سائنس دان اِسحاق نیوٹن نے دیا۔ نیوٹن 1642ء میں اِنگلستان میں پیدا ہُوا تھا۔

نیوٹن نے کہا کہ دو طاقتیں ایسی ہیں جو خلا میں ایک چیز کو دوسری چیز کے گِرد گھُمائے رکھتی ہیں۔ اِن میں سے ایک طاقت گھومنے والی چیز کا مِعیارِ حرکت (Momentum) ہے۔ ایک دفعہ جو چیز خلا میں کسی دوسری چیز کے گرد چکّر لگانا شروع کر دے تو وہ اُس وقت تک چکّر لگاتی رہے گی جب تک کوئی اور طاقت اُسے روک نہ دے۔ دوسری طاقت ہے کششِ ثقل (چیزوں کا ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنا)۔ کششِ ثقل گھومنے والی چیز کو اُس کے راستے سے ہٹنے نہیں دیتی۔ اِسی طریقے سے تمام سیّارے سورج کے چاروں طرف اپنے اپنے راستوں (مدار) پر چکّر لگاتے ہیں اور اِدھر اُدھر نہیں جاتے۔ اِسی طرح چاند ہماری زمین کے گِرد گھومتا ہے۔ (س۔ ل)

محمد مظہر الجلیل رومی

دونوں نے مِل کر کھچڑی پکائی

دادی جان اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ ننّھا احمد ان کے زانو پر لیٹا ہوا تھا۔ پاس ہی پائینتی پر گیارہ سالہ مریم بیٹھی ہوئی تھی۔ دادی جان نے کہانی شروع کی۔ "ایک تھا چڑا، ایک تھی چڑیا۔ چڑا لایا چاول کا دانا، چڑی لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی" .....

مریم نے بیچ میں ٹوک کر پوچھا، دادی جان کیا کھچڑی دال چاول ہی سے پکائی جاتی ہے یا کسی اور طرح سے بھی پکتی ہے؟"

دادی جان نے کہا "بیٹی، میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

مریم بولی "دادی جان، آج اسکول میں پیریڈ ختم ہونے کے بعد میں، میمونہ اور شازیہ کلاس روم میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، کہ ہماری اردو کی ٹیچر مس کوثر ادھر سے گزریں۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر کہا: "یہ کیا کھچڑی پک رہی ہے؟" دادی جان، ہم تو صرف باتیں کر رہے تھے کوئی چیز پکا نہیں رہے تھے، پھر مس کوثر نے ایسا کیوں کہا؟"

دادی جان نے مسکرا کر کہا "بیٹا تمہاری مس نے کھچڑی پکانا محاورے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس محاورے کا مطلب ہے، آپس میں کھُسر پھُسر کرنا یا آہستہ آہستہ صلاح مشورہ کرنا۔ جب تم بڑی جماعتوں میں جاؤگی اور اردو کی بڑی بڑی کتابیں پڑھوں گی تو اس وقت محاورے کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ جائے گا اور تم بھی اپنی گفتگو میں محاورے استعمال کروگی۔ اچھا، اب جاؤ۔ احمد سو گیا ہے۔ تم بھی جا کر سو جاؤ۔ تمہیں صبح سویرے اسکول جانا ہوتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ سونے سے پہلے آیۃ الکرسی ضرور پڑھ لینا۔"

مریم اپنے تین سالہ بھائی احمد اور والدین کے ہمراہ اسلام آباد کے سیکٹر ایف میں رہتی ہے۔ دادی جان کراچی میں رہتی ہیں اور سال میں دو تین ماہ کے لئے بیٹے کے پاس اسلام آباد، آ جاتی ہیں۔ گھر میں ایک سال سے ایک ادھیڑ عمر کی

عورت عنایت بی بی ملازم ہے جو کھانا پکانے اور باورچی خانے کی صفائی کا کام کرتی ہے۔ گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ منظور نامی لڑکا کرتا ہے۔ اسے ملازم ہوئے 8 ماہ ہو گئے ہیں۔ مریم کے والد پرویز کرامت صاحب ایک غیر ملکی فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ والدہ سوشل کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود بچّوں اور گھر کے معاملات پر پورا دھیان دیتی ہیں۔ سودا سلف بھی خود خرید کر لاتی ہیں۔ پرویز صاحب کا خاندان نہایت خوش قسمت لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ مریم نہایت ذہین اور چالاک ہے۔ اس کی فطرت میں تجسّس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ہر چیز کی ٹوہ لگانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے، کہ مریم کے والدین گھر پر موجود نہ تھے۔ دادی جان اپنے کمرے میں احمد میاں کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ دن کے تقریباً ایک بجے مریم نے اسکول سے آکر صدر دروازے کی گھنٹی بجائی تو پتا چلا کہ بجلی غائب ہے۔ بجائے دستک دینے کے وہ کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹروں کی طرف چلی گئی جہاں عنایت بی بی اور منظور الگ الگ کمروں میں رہتے تھے۔ عنایت بی بی کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سے منظور کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے وہ عنایت سے کسی اہم مسئلے پر گفت گو کر رہا ہو۔

مریم کو بڑا تعجّب ہوا۔ کیونکہ عنایت اور منظور میں بالکل نہیں بنتی تھی اور مریم کے گھر والوں کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے کی بُرائیاں کرتے تھے۔ ان کی آپس میں بول چال بھی بند تھی۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سُنا۔ منظور کہہ رہا تھا "ہاں تو ماسی عنایت، پرسوں کا دن مناسب رہے گا۔ اس دن دادی جان ایک بجے کی فلائٹ سے کراچی جا رہی ہیں۔ گھر والے انہیں چھوڑنے ہوائی اڈے پر جائیں گے۔ تم نے ان لوگوں پر اچھا اثر ڈالا ہے اور وہ تم پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں باورچی خانے میں چھوڑ کر باقی گھر بند کر جائیں گے۔ میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر دس بجے چھٹی کر لوں گا۔ صاحب لوگوں کے جاتے ہی میں اور میرے ساتھی نیلے رنگ کی پک اپ لے کر آ جائیں گے۔ اس قسم کی پک اپ صاحب کے دفتر سے روز آتی جاتی رہتی ہے اس لئے کسی کو شُبہ نہ ہو گا۔ میں نے بڑے دروازے کی چابی بنوالی ہے۔ ہم لوگ منٹوں میں سارا سامان صاف کر دیں گے اور تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیں گے تاکہ تم پر شُبہ نہ ہو۔

مریم نے اس سے آگے سننے کی ضرورت محسوس نہ کی اور دبے پاؤں واپس جا کر صدر دروازے پر دستک دی۔ دادی جان نے دروازہ کھولا۔ مریم نے ان سے کچھ نہ کہا۔ نہایت اطمینان سے کپڑے بدلے۔ پھر اپنی سہیلی میمونہ کو ٹیلی فون کیا اور اس کے والد کے بارے میں پوچھا۔ جو پولیس کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ وہ گھر پر موجود تھے۔ وہ دادی جان سے اجازت لے کر میمونہ کے گھر گئی اور اس کے والد کو اپنے ملازموں کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ میمونہ کے والد شمشاد صاحب نے اسے بہت شاباش دی اور کہا، بیٹا، اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ

کرنا ورنہ منظور اور اس کے ساتھی ہوشیار ہو جائیں گے اور ہم انہیں رنگے ہاتھوں نہ پکڑ سکیں گے۔

تیسرے دن دادی جان کراچی جانے والی تھیں۔ احمد ضد کر رہا تھا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ مریم کی والدہ دادی جان کا سامان پیک کر رہی تھیں۔ 11 بجے پرویز کرامت صاحب دفتر سے آئے تو سب لوگ ان کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ پرویز صاحب نے گھر کے دروازے بند کیے، صدر دروازے کو تالا لگایا، عنایت بی بی کو گھر کا خیال رکھنے کا کہہ کر ائیر پورٹ روانہ ہو گئے۔ مریم کے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ابّو اور امّی کو منظور اور عنایت کی سازش کا حال بتائے۔ لیکن شمشاد صاحب کی ہدایت یاد آ گئی اس لئے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی خاموشی کو اس کے والدین نے بھی محسوس کیا لیکن کہا کچھ نہیں۔

جب دادی جان کو رخصت کر کے مریم اور اس کے والدین گھر واپس پہنچے تو شمشاد صاحب نے ان کا استقبال کیا۔ پرویز صاحب بہت حیران ہوئے۔ لیکن جب انہیں تمام واقعات کا پتا چلا تو مریم کو بلا کر خوب پیار کیا اور شاباش دی۔ شمشاد صاحب نے بتایا کہ ڈاکوؤں کا پورا گروہ گرفتار ہو گیا ہے۔ اور پولیس ان سے بہت کچھ اُگلوا رہی ہے۔ عنایت بی بی بھی ان کے ساتھ ہے۔

دوسرے دن پتا چلا کہ عنایت اور منظور آپس میں رشتے دار ہیں۔ اور اس طرح کی کئی وارداتیں کر چکے ہیں۔ شمشاد صاحب نے پرویز صاحب کو نصیحت کی کہ آئندہ بغیر تحقیق کئے کسی کو ملازم نہ رکھیں اور ہر ملازم کا نام پتا تھانے میں درج کرائیں۔

مریم کو پولیس کی طرف سے تعریفی سرٹیفکیٹ ملا۔ اس کے ابّو نے بھی اسے انعام دیا۔ اس نے اپنے ابّو سے کہا "ابّو، منظور اور عنایت نے مل کر کھچڑی پکائی تھی۔" ابّو نے ہنس کر کہا "ہاں، لیکن تم نے ان کی ہانڈی چوراہے پر پھوڑ دی۔"

مریم نے حیران ہو کر پوچھا "یہ ہانڈی کا کیا معاملہ ہے؟" ابّو نے کہا "یہ بھی ایک محاورہ ہے۔"

یہ مہینا کتنے دِن کا ہے؟

"بیٹی! ذرا کیلنڈر میں دیکھنا۔ یہ مہینا کتنے دن کا ہے؟ دُودھ والے کا حساب کرنا ہے" دادی امّاں نے عالیہ سے کہا۔

لے دادی امّاں، کیلنڈر میں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی چند سکنڈ میں بتائے دیتی ہوں یہ دیکھیے:"

یہ کہ کر عالیہ نے بائیں ہاتھ کی مُٹھی بند کی اور اُنگلیوں کے جوڑوں پر دائیں ہاتھ کی اُنگلی رکھ کر بولی "یہ اُبھرے ہوئے جوڑ اِکتیس دن کے ہیں؛ اور اِن کے درمیان جو گڑھے ہیں، یہ تیس دن کے۔ اب اِن جوڑوں اور گڑھوں پر اُنگلی رکھ کر گنتی جائیے: جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست۔ یہ مہینا اگست کا ہے اور اگست جوڑ پر آیا ہے، للہٰذا یہ اکتیس دن کا ہے۔ بارہ مہینوں میں صرف فروری ایسا مہینا ہے جو اٹھائیس یا اُنتیس دن کا ہوتا ہے۔ باقی سب مہینے تیس یا اکتیس دن کے ہوتے ہیں۔

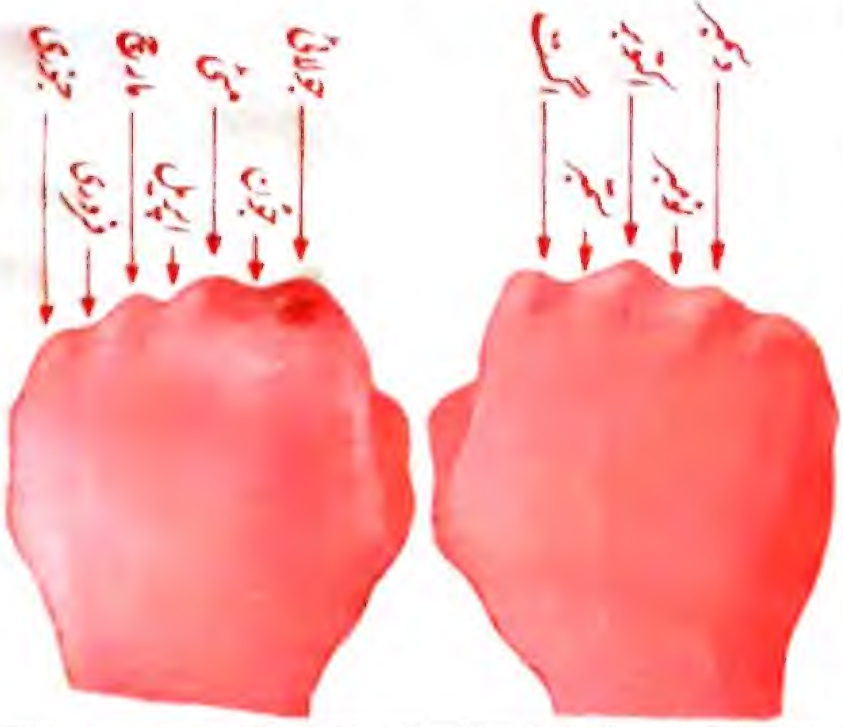

Sharjeel Ahmed

فوگی میرا دوست

محمد اقبال ثاقب

ہمارے ہاں دیہاتوں میں شاید ہی کوئی زمیندار ایسا ہو، جس نے اپنے مال مویشیوں کی حفاظت کے لئے کوئی کتا نہ پال رکھا ہو۔ ابراہیم نے بھی اپنے چھوٹے سے فارم پر ایک "فوگی" نامی کتا رکھا ہوا تھا۔ فوگی عام کتوں کی نسبت بہت سمجھ دار کتا تھا۔ ابراہیم جب اپنے مویشیوں کو قریبی جنگل میں چرانے کے لیے لے جاتا تو فوگی بھی ساتھ ہو لیتا۔ جنگل کے قریب سے ہی ایک ریلوے لائن گزرتی تھی۔ فوگی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ گشت کرتا رہتا اور اگر کوئی مویشی ریلوے لائن کی طرف آنے کی کوشش کرتا تو وہ بھونک کر اس پر جھپٹ پڑتا اور اس کو واپس جنگل میں دھکیل دیتا۔ ابراہیم کو فوگی کی اس کارکردگی پر مکمل اعتماد تھا اور وہ ریلوے لائن کے خطرے سے بالکل بے فکر ہو کر مویشی چراتا۔

ایک دن ابراہیم جنگل میں مویشی چرا رہا تھا کہ اچانک اسے کوئی بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ وہ مویشیوں کو جنگل میں چرتا چھوڑ کر گاؤں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ جلدی سے کام نپٹا کر مویشیوں کو سنبھال لوں گا۔ مگر وہ کام میں کچھ اس قدر الجھ گیا کہ شام ہو گئی۔ اچانک اسے مویشیوں کا خیال آیا تو بوکھلا سا گیا۔ وہ جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنے فارم کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اسے فوگی کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے جنگل جانے کی بجائے اپنا رخ فارم کی طرف موڑ دیا۔ وہ اپنے تمام مویشیوں کو فارم پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ فوگی نے مالک کو دیکھا تو دُم ہلاتا ہوا اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ ابراہیم کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "مالک، مجھے شاباش دو کہ میں تمہاری غیر موجودگی میں تمام مویشیوں کو بڑی حفاظت کے ساتھ جنگل سے لے آیا ہوں۔"

ابراہیم بھی فوگی کی طرف بڑے تشکر آمیز انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد ابراہیم کا فوگی پر اعتماد اور بھی زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔ اب تو اسے جب بھی کوئی چھوٹا موٹا کام پڑتا وہ مویشیوں کو فوگی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا اور کام کر کے واپس آ جاتا۔

ایک شام ابراہیم اپنی بھینسوں کا دودھ دوہ رہا تھا کہ اچانک فوگی نے ایک ایسی حرکت کر دی جس کے بارے میں ابراہیم سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے دودھ کے ایک برتن

میں منہ ڈال دیا تھا۔ ابراہیم کو فوگی کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا۔ اس نے فوگی کو ایسا سبق سکھانے کا ارادہ کر لیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت کرنے کی جرات نہ کر سکے۔ ابراہیم نے بانس کا ایک تین چار فٹ لمبا، موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لیا اور فوگی کو اپنی طرف بلایا۔ فوگی کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ ڈرا ڈرا اور سہما سہما چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اپنے مالک کی طرف بڑھنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو "مالک، مجھ سے غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ معاف کر دیں۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"

مگر ابراہیم اسے سزا دینے پکّا ارادہ کر چکا تھا۔ فوگی کا یہ انداز اس کا غصہ ٹھنڈا نہ کر سکا۔ جونہی وہ قریب پہنچا ابراہیم نے کس کر ایک ڈنڈا اس کی پشت پر جڑ دیا۔ درد کی شدت سے وہ رونے کے انداز میں ٹاؤں، ٹاؤں کرنے لگا، مگر اپنے مالک سے دور بھاگنے کی جُرأت نہ کی۔ ابراہیم نے اسی طرح کے پانچ چھ زوردار ڈنڈے برسا دیئے۔ فوگی بے بس ہو کر مالک کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اسے یوں قدموں میں آ بیٹھتے دیکھ کر ابراہیم کو رحم آ گیا۔ اس نے ڈنڈا پھینک دیا اور قریب پڑی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے وفادار کتے کو اتنا شدید مارنے پر افسوس ہو رہا تھا۔

اگلے روز حسبِ معمول ابراہیم مویشیوں کو چرانے کے لئے جنگل میں پہنچ گیا۔ فوگی بھی اس کے ساتھ تھا۔ دوپہر کے وقت تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے وہ اپنے فارم پر آ گیا۔ فوگی مویشیوں کی نگرانی کے لئے جنگل میں موجود تھا۔ ابراہیم ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد جنگل میں واپس پہنچا تو اسے فوگی کہیں نظر نہ آیا ___ تمام مویشی ایک بڑے درخت کے سائے میں بیٹھ کر جگالی کر رہے تھے۔ وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ اس نے فوگی کو جنگل میں بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ "شاید، کل شام کی مار کی وجہ سے ناراض ہو کر کسی طرف چلا گیا ہے۔" ابراہیم نے دل ہی دل میں خیال کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ کسی شکار کے تعاقب میں دور نکل گیا ہو؟" ابراہیم کو ایک دوسرا خیال آیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ فوگی جیسا وفادار کتا اتنی سی بات پر ایسا نہیں کر سکتا۔

ابراہیم شام تک فوگی کا جنگل میں انتظار کرتا رہا مگر وہ واپس نہ آیا۔ اب اسے پختہ یقین ہو گیا کہ فوگی ناراض ہو کر بھاگ گیا ہے۔ جب شام کی تاریکی میں کافی اضافہ ہو گیا تو ابراہیم مویشیوں کو لے کر فارم پر آ گیا۔ وہ فوگی کی گم شدگی کی وجہ سے پریشان تھا۔ ایک ہفتے تک فوگی کا جب کوئی سُراغ نہ ملا تو ابراہیم بالکل مایوس ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ فوگی اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

فوگی کو لاپتا ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے تھے۔ ابراہیم نے اپنے فارم کے لئے کوئی دوسرا کتا نہیں رکھا تھا۔ ایک شام ابراہیم فارم سے آ کر گھر میں ابھی بیٹھا ہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ ابراہیم دروازے پر گیا تو ایک اجنبی شخص کو ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھامے کھڑا ہوا پایا۔ اس سے پہلے کہ ابراہیم اجنبی سے آنے کی وجہ پوچھتا، کتا دُم ہلاتا ہوا ابراہیم کے قدموں کی جانب لپکا۔ اس نے کتے کو بغور دیکھا تو یہ فوگی ہی

تھا۔ مگر وہ پہلے سے بہت کم زور ہو چکا تھا۔

"السلام علیکم" اجنبی ذرا توقف سے بولا۔

"وعلیکم السلام" ابراہیم نے جواب دیا۔

"میں آپ کا کتّا واپس کرنے آیا ہوں۔" اجنبی نے کہا۔

"بھائی، یہ تو میں آپ سے بعد میں پوچھتا ہوں کہ یہ کتّا آپ کو کہاں سے ملا۔ آیئے، میں آپ کو بیٹھک میں بٹھاتا ہوں اور آپ کے لئے لسّی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر ابراہیم نے اجنبی کے ہاتھ سے کتّے کی زنجیر پکڑ لی اور اس کو گھر میں چھوڑ کر اجنبی مہمان کی ٹھنڈی اور میٹھی لسّی سے خاطر مدارت کی۔ مہمان جب کافی حد تک پُر سکون ہو گیا تو ابراہیم نے اس سے کتّے کے متعلق پوچھا۔ مہمان نے اپنی بات یوں شروع کی:

"ابراہیم بھائی، میرا نام شیرا ہے اور میں یہاں سے تقریباً دس میل دور ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میں شرافت کی زندگی سے بھٹکا ہوا ایک بُرا انسان تھا۔ لیکن اس کتّے کی وفاداری نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ میں نے چوری کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا۔ مجھے اپنے ارد گرد کے علاقے میں کسی کی کوئی بھی چیز اچھی نظر آتی تو میں اسے ہر حال میں چرانے کی کوشش کرتا۔ میں نے آپ کے کتّے کی بھی بڑی شہرت سن رکھی تھی۔ میری نیّت اس کتّے کے بارے میں خراب ہو گئی۔ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے ایک دن میں سائیکل پر سوار ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنگل کے قریب سے گزر رہا تھا کہ مجھے آپ کا کتّا نظر آیا۔ میں نے قریب کسی شخص کو نہ پا کر اسے چوری کرنے کا پروگرام بنایا۔ میرے پاس کچّا گوشت تھا۔ میں نے دو بوٹیاں زمین پر پھینکیں تو کتّا بوٹیاں اٹھانے کے لئے میرے قریب آ گیا۔ میں نے پہلے ہی ہاتھ میں رسّی پکڑ رکھی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کر کے میں نے رسی کتّے کے گلے میں ڈال دی اور سائیکل پر سوار ہو کر کتّے کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ میں نے بھاگ جانے کے خدشے سے اسے کھونٹے سے باندھ دیا اور اس کی خوراک کا اعلیٰ بندوبست کیا تاکہ یہ اپنے مالک کو بھول کر میرے ساتھ جلد مانوس ہو جائے۔ مگر کافی مہینوں تک بہت زیادہ کوشش کرنے کے باوجود اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں جب بھی کتّے کے قریب آتا وہ بے قرار ہو کر کھونٹے کے ارد گرد چکر کاٹنے شروع کر دیتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے مجھ سے التجا کر رہا ہے "ظالم، مجھے آزاد کر دو۔ میں اتنا نمک حرام نہیں ہوں جو ذرا سے لالچ کی وجہ سے اپنے اصل مالک کو بھول جاؤں۔"

کتّے کی اپنے مالک سے اس قدر وفاداری دیکھ کر میرے دل کی حالت بڑی عجیب ہو جاتی۔ آج سے چند روز پہلے حسب معمول میرے قریب آنے پر کتّے نے اس قدر شدید بے چینی کا اظہار کیا کہ میں بُت بن کر کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں سوچوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ مجھے خیال آیا کہ واقعی، جب انسان انسانیت کی راہ سے بھٹک جاتا ہے تو اس کی حالت حیوانوں سے بد تر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک نا سمجھ اور بے زبان کتّا اپنے پیٹ کی خاطر میرے دیئے ہوئے کسی لالچ میں نہیں آیا اور اپنے اصل مالک کی فرمان برداری کرنے پر تلا ہوا ہے۔ جب کہ میں، جس کو اس کے مالک نے عقل و دانش جیسی بے شمار دیگر نعمتوں سے مالا مال کیا ہے، روپے پیسے کی حرص اور لالچ کی خاطر اپنے مالک کی فرمان برداری ترک کر دی اور برائی کا راستہ اختیار کر لیا۔ یہی وہ سوچ تھی جس نے میرے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا۔ لہٰذا میں نے بُری زندگی ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے مالک کی طرف رجوع کر لیا۔ اس نئی زندگی سے مجھے جب سکون اور اطمینان نصیب ہوا تب مجھے کتّے کی اس قدر شدید بے چینی کی وجہ سمجھ میں آئی۔ لہٰذا آج میں اس کی بے چینی ختم کرنے کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔"

مہمان کی باتیں سُن کر ابراہیم کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے بیٹھک کی کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو فوجی پُر سکون کھڑا تھا۔ اس کی بے مثال وفاداری ایک لاجواب کارنامہ سرانجام دے چکی تھی۔

بتائیے؟

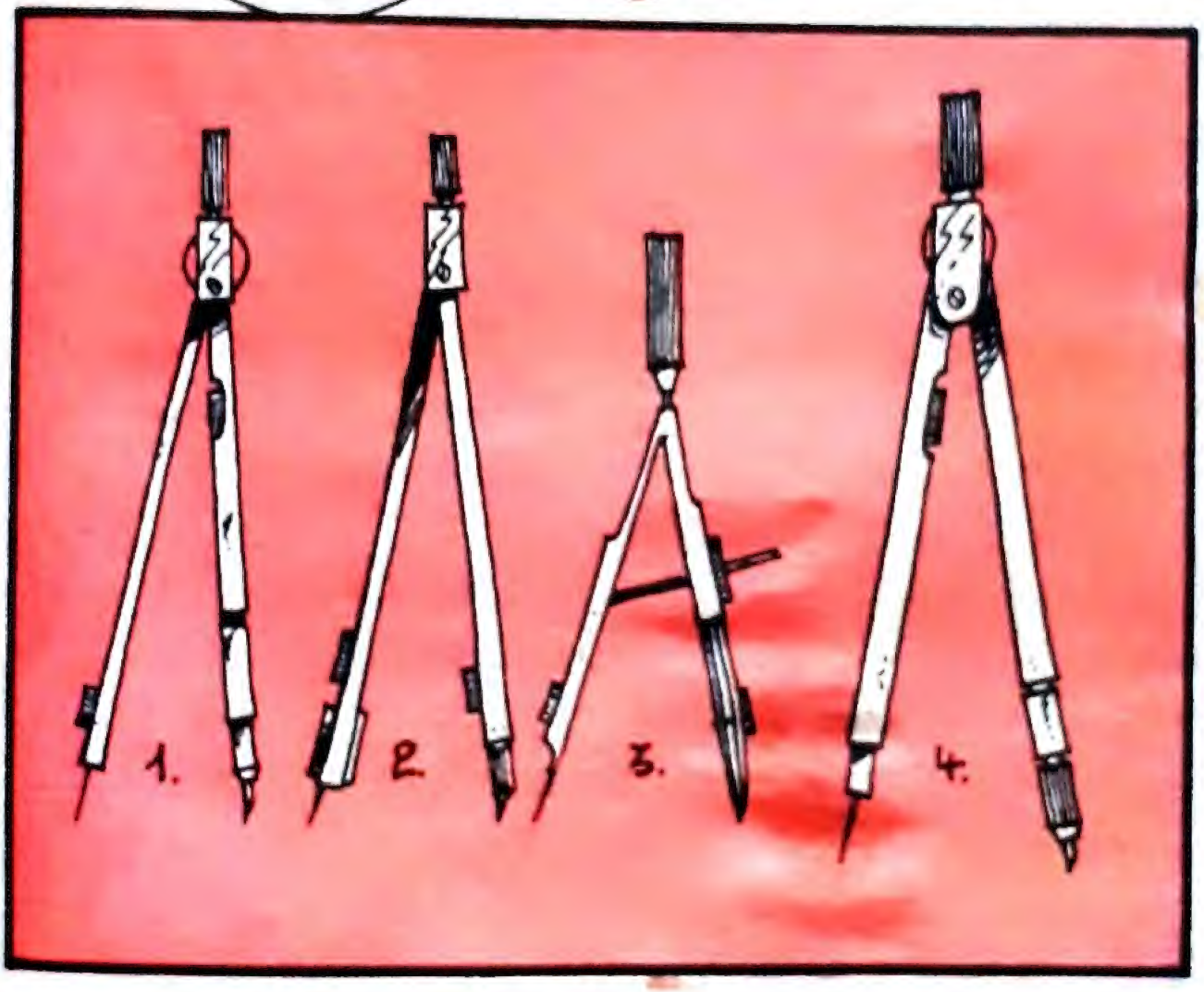

ان میں سے کس پر کار (کمپاس) سے اوپر کا دائرہ بنایا گیا ہے؟ پہلے غور سے دیکھ کر خود معلوم کیجیے۔ پھر صفحہ 37 پر جواب دیکھیے۔

عہد کا پاس

مقبول انور داؤدی مرحوم

اندلس کے بادشاہ عبدالرحمٰن الداخل کے عہدِ حکومت میں ایک عرب نے بڑی جاں فشانی اور محنت سے حکومت کی خدمت کی اور اس کے صلے میں اُسے سردار کا خطاب ملا۔

ایک روز یہ عرب سردار اپنے مکان کے پائیں باغ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عیسائی نوجوان بڑی پریشانی کے عالم میں بھاگتا ہوا باغ کے اندر داخل ہوا اور آتے ہی عرب سردار کے قدموں میں گر پڑا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

سردار نے اسے بڑی محبّت سے اٹھایا اور پوچھا "نوجوان، کیا بات ہے؟ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

نوجوان نے کہا "سردار! بازار میں میرا ایک شخص سے جھگڑا ہو گیا۔ میں نے غُصّے میں آکر اس کے سر پر ایک لکڑی دے ماری جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے پھر کانپتی ہوئی آواز میں کہا "سردار! میرا اُسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے۔ اس کے ساتھی میرا پیچھا کر رہے ہیں اور مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔"

نوجوان پھر سردار کے قدموں میں گر پڑا اور چلّایا "سردار. میری جان بچالو. میں نے جان بوجھ کر اسے ہلاک نہیں کیا۔"

عرب سردار نے اسے اٹھایا اور کہا "اے نوجوان. اب تم میری پناہ میں بالکل محفوظ ہو. تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

اس کے بعد سردار نے اسے ایک خفیہ کمرے میں چھپا دیا اور باہر سے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔

جب سردار واپس باغ میں آیا تو دیکھا کہ ایک غضب ناک ہجوم ایک لاش کو اٹھائے ہوئے باغ میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ لاش ایک نوجوان کی تھی۔ ہجوم میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر لاش کو سردار کے سامنے کر دیا۔ سردار نے جونہی لاش پر نظر ڈالی. تڑپ کر زمین پر گر گیا۔ یہ لاش اس کے نوجوان اکلوتے بیٹے کی تھی۔

ہجوم میں سے ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا "اے سردار! آپ کے بیٹے کو ایک اوباش نے قتل کیا ہے۔ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ یہیں کہیں گم ہو گیا ہے۔"

سردار کو اب یقین ہو گیا کہ جس عیسائی کو اس نے پناہ دی ہے۔ وہی اس کے بیٹے کا قاتل ہے۔ لوگوں کا ہجوم باغ کے کونوں کھدروں میں مجرم کو تلاش کر رہا تھا۔ لیکن کافی تلاش کے بعد جب کامیابی نہ ہوئی تو لوگ مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔

عیسائی نوجوان یہ سب کچھ دیکھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ لوگوں کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ اسے موت اپنے سر پر منڈلاتی ہوئی نظر آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ ابھی مقتول کا غضب ناک باپ آکر اس کا سر تن سے جدا کر دے گا۔

نوجوان کو غسل دینے کے بعد دفن کر دیا گیا۔ تمام عزیز و اقارب رنج و غم سے نڈھال ہو رہے تھے کہ سورج غروب ہونے لگا اور رات کی تاریکی پھیلنے لگی۔ دن بھر کے تھکے ہارے تمام لوگ جب گہری نیند سو گئے تو سردار اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے کمرے کی طرف گیا جہاں اس نے اپنے بیٹے کے قاتل کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے تالا کھولا اور اس کے اندر داخل ہو گیا۔

عیسائی نوجوان نے سردار کو دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔

سردار نے کہا "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں نوجوان! میں جانتا ہوں کہ تم میرے اکلوتے بیٹے کے قاتل ہو. لیکن میں تمہیں پناہ دے چکا ہوں۔ اس وقت تم میرے مہمان ہو۔"

عیسائی نوجوان حیران پریشان سردار کو دیکھتا جا رہا تھا۔

"یہ لو کچھ روپے جو تمہارے سفر میں کام آئیں گے" سردار نے پھر کہا۔ "اور سورج نکلنے سے پہلے اس شہر سے دُور نکل جاؤ۔"

سردار کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب رواں تھا۔ نوجوان نے سردار کو سلام کیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا اور جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا سردار کی آنکھیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

انوکھا ڈاکو

حسن ندیم مظفر گڑھ

ٹرین کی رفتار بہت تیز تھی۔ رات کا وقت تھا اور فراٹے بھرتی ہوئی ٹرین اپنی منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ مسافر یا تو اونگھ رہے تھے یا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اچانک کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک نقاب پوش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس کے خطرناک ارادوں کی چغلی کھا رہا تھا۔ سب سے پہلے رحمان صاحب کی نظر اس پر پڑی اور ان کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اونگھتے اور سوتے ہوئے مسافر ہڑبڑا کر بیدار ہو گئے اور قبل اس کے کہ رحمان صاحب سے چیخنے کا سبب دریافت کرتے، نقاب پوش کی موجودگی نے انہیں ساری کہانی سنا دی۔ خوف سے ان کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے اور وہ نقاب پوش کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

نقاب پوش ان کی اس حالت سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں بعد اپنا پہلا حکم سنایا "تمام لوگ اپنی اپنی نقدی اور قیمتی اشیا ایک جگہ ڈھیر کر دیں۔"

اس کے ان الفاظ پر مسافروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اپنے مال سے محروم ہونے پر کوئی بھی تیار نہ تھا۔ ابھی وہ اسی کشمکش میں تھے کہ نقاب پوش غصے سے چلایا "ایک منٹ کے اندر اندر سب چیزیں ایک جگہ اکٹھی کر دیں ورنہ ۔ ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا خوفناک ریوالور ان کے سامنے لہرایا۔

سب لوگ اس کا مطلب سمجھ گئے تھے اور بادلِ ناخواستہ اپنی اپنی نقدی، گھڑیاں اور دوسری قیمتی اشیا ایک جگہ ڈھیر کر رہے تھے۔ ایک مسافر نے تو فرماں برداری کی انتہا کر دی۔ اس نے اپنی چادر میں سب سامان باندھا اور گٹھڑی بنا کر نقاب پوش کے قریب رکھ دی۔ اب ٹرین کی رفتار آہستہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسٹیشن قریب آ گیا ہے۔ نقاب پوش نے جلدی سے گٹھڑی اٹھائی اور اُلٹے قدموں دروازے کے قریب پہنچا۔ پھر چند لمحوں بعد بڑی گمبھیر آواز میں بولا:

"ایک ڈاکو کے خوف سے تو تم سب نے اپنی جمع پونجی اس کے حوالے کر دی۔ مگر خدا کے خوف سے برائیوں سے بچنے اور نیکیوں کی طرف رغبت کا خیال بھی کبھی تمہارے دل میں آیا؟ کبھی اللہ کی راہ میں غریبوں پر خرچ کرنے کا بھی سوچا؟"

یہ کہہ کر نقاب پوش نے گٹھڑی مسافروں کی طرف پھینکی اور باہر چھلانگ لگا کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ (پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)۔

ایسا ضرور ہو گا!

ام کلثوم، چیچہ وطنی

ہمارا جہاز اس وقت ڈھاکے کے ہوائی اڈے پر لینڈ کر رہا تھا اور ہمارا دل دادی اماں سے ملنے کے شوق میں بلیوں اچھل رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ہوائی جہاز نیچے اترا۔ ہم کسٹم کے مراحل سے گزر کر ائرپورٹ سے باہر آئے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر دادی اماں کے گھر پہنچے۔ عادل بھائی نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور میں نے اماں کے گھر کی گھنٹی بجائی۔ دادی اماں اپنے پوتے پوتیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

ہم ایک ماہ دادی اماں کے پاس رہے۔ اس دوران میں ہم نے ڈھاکے اور اس کے آس پاس کی بستیوں کی خوب سیر کی اور دادی اماں سے خوب کہانیاں بھی سنیں۔

ایک رات دادی اماں ہمیں کہانی سنا رہی تھیں تو ننھی سارہ نے ان سے پوچھا "دادی اماں، بنگلہ دیش پہلے پاکستان کا حصہ تھا اور اس کا نام مشرقی پاکستان تھا۔ یہ پاکستان سے علیحدہ کیسے ہوا؟"

دادی اماں کہنے لگیں "سارہ بیٹی، تم نے بہت اچھا سوال

کیا۔ دراصل بات ہے کہ جب 1965ء کی جنگ میں ہندوستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے مسلمانوں کے درمیان نفرتوں کے بیج بونے شروع کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے دور ہٹنا شروع ہو گیا اور پھر دسمبر 1971ء میں دشمن ہمارے سیاسی لیڈروں کی غلطیوں سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ اور اس طرح ہمارے بزرگوں نے اسلام کی خاطر جو ملک حاصل کیا تھا، وہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ دعا کرو کہ خدا کوئی ایسا ذریعہ پیدا کرے جس سے ایک بار پھر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اکٹھے ہو جائیں۔ اس طرح ہمارے بزرگوں کی روحوں کو سکون حاصل ہو گا۔"

ہم جو خاموش بیٹھے دادی امّاں کی باتیں غور سے سن رہے تھے، ایک دم بول اٹھے "اِن شاء اللہ، ایسا ضرور ہو گا۔"

(دوسرا انعام : 45 روپے کی کتابیں)۔

تعلیم و تربیت کی خاطر

رومان سعدیہ، چشتیاں

یوں تو ہمیں رسالے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن اپنے ابّا جان اور بھائی جان کے ڈر سے ہم اپنا یہ شوق پورا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ایک دن اپنی کزن کی زبانی تعلیم و تربیت کی تعریفیں سن سن کر ہمارا دل بے قرار ہو گیا۔ چناں چہ ہم نے اپنا جیب خرچ جو ہم دس دنوں سے جمع کر رہے تھے، نکال کر اسے دے دیا اور کہا کہ آئندہ ماہ کا تعلیم و تربیت میرے لئے بھی خرید لینا۔

وہ پیسے لے کر چلی گئی اور ہم بے چینی سے یکم اکتوبر کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ہمارے دل میں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ابّا جان یا بھائی جان کو پتا چل گیا تو خیر نہیں، کیوں کہ وہ رسالوں کے بہت خلاف تھے۔ کہتے تھے کہ رسالے پڑھنے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔

آخر خدا خدا کر کے تعلیم و تربیت ہمیں ملا۔ ہم خوشی سے پھولے نہ سمائے اور اسے پڑھنے کی خاطر اپنے گھر کے سب سے پچھلے کمرے میں گھس گئے کہ ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ ہم نے کمرے میں روشن دان کے نیچے میز اور میز کے اوپر کرسی رکھی تاکہ اگر کسی نے ادھر کا رخ کیا تو ہم جلدی سے کرسی کے اوپر چڑھ کر رسالہ باہر پھینک دیں گے۔

ابھی ہم کہانیوں کے نام ہی پڑھ پڑھ کر خوش ہو رہے تھے کہ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ ہم جلدی سے میز پر چڑھ کر رسالہ باہر پھینکنے لگے ہی تھے کہ ایسا پاؤں پھسلا کہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ اتنی دیر میں ابّو کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ ہمارے سر اور ٹانگ سے خون نکل رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ہمیں اٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کی اور ہم گھر آ گئے۔

گھر آ کر ابّو نے رسالہ اٹھایا اور اپنے کمرے میں جا کر پڑھنے لگے۔ تمام رسالہ پڑھنے کے بعد وہ ہمارے کمرے میں آئے جہاں ہم اپنی چوٹوں کو سہلا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں رسالہ دیا اور اگلے مہینے کے رسالے کی قیمت دے کر کہا "تم نے صحیح رسالہ چنا ہے۔ اب کورس کی کتابوں کے ساتھ اس کا مطالعہ بھی کرنا۔ اس سے تمہارے علم اور سمجھ بوجھ میں اضافہ ہو گا۔" (تیسرا انعام : 40 روپے کی کتابیں)۔

بچت اچھی عادت ہے

عذرا شوکت، ساہیوال

نمرہ اور حمیرا دو بہنیں تھیں۔ وہ ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ نمرہ بہت سمجھ دار اور عقل مند تھی، لیکن حمیرا ضدی اور لاپروا تھی۔

"حمیرا پلیز، اتنی فضول خرچی نہ کیا کرو۔ ٹافیاں کھا کھا کر سارے دانت خراب کر لیے ہیں تم نے" نمرہ حسبِ معمول بہن کو سمجھا رہی تھی۔

"مت کیا کرو مجھے نصیحت۔ میں اپنے پیسے خرچ کرتی

ہوں۔ تمہیں کیا؟" حمیرا بدتمیزی سے بولی تو نمرہ خاموش ہوگئی۔

اب حمیرا تو اپنے سارے پیسے خرچ کر دیتی لیکن نمرہ ان میں سے زیادہ تر بچالیتی۔ اگر کبھی امّی کو ضرورت ہوتی تو وہ جھٹ سے دے دیتی۔ امّی بھی حمیرا کو سمجھاتیں مگر وہ فضول خرچی سے باز نہ آتی۔

ایک رات حمیرا کے دانت میں درد اٹھا۔ ساری رات سب گھر والے بے آرام رہے۔ صبح کو ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے بتایا کہ بے تحاشا ٹافیاں کھانے سے دانت میں کیڑا لگ گیا ہے۔ اب اسے نکالنا پڑے گا۔ یوں حمیرا کا ایک دانت نکال دیا گیا۔

ابّو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ حمیرا کو دانت کے درد کی وجہ سے بخار ہوگیا تھا اور امّی کے پاس دوا کے لئے اب اور پیسے نہ تھے۔ الماری کی چابی بھی ابّو کے بریف کیس میں تھی۔ نمرہ نے یہ دیکھا تو اپنے سارے جمع کیے ہوئے پیسے امّی کے سامنے رکھ دیئے اور کہا کہ ان سے حمیرا کا علاج کرالیں۔

حمیرا ٹھیک ہوگئی تو امّی نے نمرہ سے پوچھا "تم نے وہ پیسے کسی سے ادھار لیے تھے؟"

"جی نہیں، امّی۔ میں ادھار کے سخت خلاف ہوں۔ وہ تو میری جمع شدہ رقم تھی۔" یہ سن کر حمیرا کا سر شرم سے جھک گیا۔

"دیکھو، حمیرا۔ اگر نمرہ بھی تمہاری طرح فضول خرچی کرتی تو تمہارے علاج کے لیے مجھے کسی سے ادھار مانگنا پڑتا۔"

حمیرا نے امّی سے معافی مانگی اور دوسرے دن ہی وہ گلک لے آئی۔ اب وہ بھی بچت کرنے لگی ہے اور اس کے پاس کافی رقم جمع ہوگئی ہے۔

(چوتھا انعام : 35 روپے کی کتابیں)۔

شرارت

سیّد حسین نصر رضوی، روپوال

افضل بڑا محنتی لڑکا تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد کتابوں میں کھو جاتا۔ نہ تو اسے کھانے کا ہوش اور نہ پہننے کا۔ ہر وقت اس کے کمرے سے پڑھنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ اس کے تمام بہن بھائی سو جاتے لیکن وہ رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ جب اسے نیند ستانے لگتی تو ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر نیند کو بھگاتا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہوجاتا۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو ٹہل ٹہل کر پڑھتا۔

ایک دن اس کی بڑی بہن مصباح نے امّی سے شکایت کی کہ افضل کورس کی کتابیں پڑھنے کے بجائے بچّوں کے ناول پڑھتا ہے اور ہم سے جھوٹ بولتا ہے کہ وہ دل لگا کر محنت کر رہا ہے۔ افضل کی امی جانتی تھیں کہ افضل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتا ہے۔ مصباح سمجھتی کہ امّی جان بوجھ کر افضل کو ڈھیل دے رہی ہیں۔ اس کو جب بھی موقع ملتا افضل کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور اسے ناول پڑھنے سے منع کرتی۔

افضل اپنی بہن کی باتیں سن کر کہتا "باجی، آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کا بھائی ہوں۔ اگر آپ کا ریکارڈ نہ توڑا تو میرا نام افضل نہیں۔" مصباح بُرا سا منہ بنا کر کہتی "تم میرا ریکارڈ کیا توڑو گے۔ تمہیں تو ناول پڑھنے ہی سے فرصت نہیں۔" افضل مسکرا کر کہتا "باجی کامیابی تو میرے گرد منڈلا رہی ہے۔ جب نتیجہ نکلے گا، تو آپ دیکھ لینا۔ آپ کی طرح اخباروں میں میری تصویریں بھی چھپیں گی۔ اخبار والے میرا انٹرویو لینے آئیں گے۔" لیکن مصباح کو افضل کی باتوں پر یقین نہ آتا۔

اب امتحان شروع ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے۔ ایک رات مصباح پڑھ کر فارغ ہوئی تو اس نے سوچا کہ افضل کے کمرے میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی کھڑکی کے پاس گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کی میز پر بچوں کے ناول بکھرے پڑے ہیں اور وہ ایک ناول ہاتھ میں لیے ٹہل

ٹل کر پڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر مصباح کو بڑا غصّہ آیا۔ وہ چپکے سے اپنی امّی کے کمرے میں گئی اور انہیں جگا کر بولی "آپ خود چل کر دیکھ لیجئے کہ افضل کیا پڑھ رہا ہے۔ میری باتوں کا تو آپ کو یقین نہیں آتا۔"

امّی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھیں اور غُصّے سے بولیں "کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" مصباح نے کہا "امّی، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں افضل کی دشمن تو نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر آپ کا اور ابّو کا نام روشن کرے، لیکن اسے تو کورس کی کتابوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ وہ تو ہر وقت ناول پڑھتا رہتا ہے۔"

امّی مصباح کے ساتھ افضل کے کمرے کی طرف گئیں اور اندر جھانک کر دیکھنے لگیں۔ وہ بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ افضل کی میز پر بچوں کے ناول پڑے ہیں اور اس کے ہاتھ میں بھی ایک ناول ہے جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہا ہے۔ انہوں نے کہا "افضل، امتحان میں صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں اور تم، عمرو اور طلسمی جال، پڑھ رہے ہو؟" مصباح ٹھیک کہتی تھی کہ تم کورس کی کتابوں کے بجائے ناول پڑھتے ہو۔ افضل اپنی امی کی باتیں سُن کر عجیب انداز سے مسکرایا اور مصباح جھنجھلا کر بولی "دیکھ لیا، امّی؟ کس بے شرمی سے مسکرا رہا ہے؟"

امّی نے غُصّے سے کہا "دروازہ کھولو۔" افضل نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ امّی نے افضل کے ہاتھ سے کتاب چھین کر فرش پر دے ماری۔ افضل خاموش کھڑا رہا۔ امّی نے کہا "جواب دو، افضل۔ خاموش کیوں کھڑے ہو؟" افضل نے کہا "میں کیا جواب دوں؟ آپ نے خود دیکھ لیا کہ میں پڑھ رہا تھا۔ امّی بولیں ہاں میں نے دیکھ لیا کہ تم ناول پڑھ رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔" افضل بدستور مسکرا رہا تھا۔

مصباح بولی "امّی، ان تمام ناولوں کو آگ لگا دیجئے۔" یہ کہہ کر وہ میز پر پڑے ہوئے ناول سمیٹنے لگی۔ افضل نے آگے بڑھ کر کہا "باجی، اگر آپ انہیں آگ لگا دیں گی تو میں امتحان کی تیاری کیسے کروں گا؟"

"تم بہت بدتمیز اور گستاخ ہو گئے ہو۔ کیا تم ناول پڑھ کر امتحان دو گے؟" امّی بولیں۔

افضل نے کہا "امّی، میں آپ کا بیٹا ہوں۔ پھر گستاخ اور بدتمیز کس طرح ہو سکتا ہوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ اور باجی چاہتی ہیں کہ میں بورڈ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کروں اور میں اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ رات گئے تک پڑھتا ہوں۔ سویرے نماز سے فارغ ہو کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کروں گا۔"

مصباح نے کہا "یہ تو ہمیں نظر آ رہا ہے کہ تم اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے کے لئے دن رات محنت کر رہے ہو۔ رات گئے تک ناول پڑھتے رہتے ہو۔"

افضل بولا "باجی، دراصل میں نے آپ کو تنگ کرنے کے لئے اپنی کورس کی کتابوں پر ناولوں کے کور چڑھا رکھے ہیں۔ یقین نہیں تو دیکھ لیجئے۔" یہ کہہ کر اس نے کورس کی کتابوں پر سے کور اتارنے شروع کر دیئے۔ "یہ دیکھئے۔ اوپر سپرمین کی کہانیاں ہیں اور اندر حساب۔ یہ ٹارزن اور سونے کی مورتی نہیں انگریزی کی کتاب ہے۔ یہ ظالم جادوگر نہیں معاشرتی علوم کی کتاب ہے۔ یہ چین کی شہزادی نہیں سائنس کی کتاب ہے۔"

افضل تمام کتابوں کے کور اتار کر مصباح اور امّی کو دکھا رہا تھا اور مصباح کا مارے شرم کے برا حال تھا۔ امّی ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔

مصباح افضل کو پیار کرتے ہوئی بولی "میرا اچھا بھائی! میرا پیارا بھیّا۔" پھر اس نے امّی سے کہا "آیئے، ہم اپنے کمرے میں چلیں۔ افضل کو پڑھنے دیجئے۔" امّی اور مصباح افضل کے کمرے سے نکل گئیں۔ افضل دل ہی دل میں اپنی شرارت پر ہنس رہا تھا۔

(پانچواں انعام : 30 روپے کی کتابیں)۔

ناشکری

شہزاد محمود، فیصل آباد

"آج پھر وہی کدو!" نعمان اسکول سے آتے ہی چیخا "کوئی اور چیز نہیں تھی پکانے کے لیے؟" وہ غصے سے بولا اور پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

امّی اس کے کمرے میں گئیں اور بولیں "دیکھو بیٹا، یہ ہمارے رسول پاکؐ کی پسندیدہ سبزی تھی اور آپؐ اسے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔"

"لیکن امّی، مجھے نہیں کھانی یہ سبزی۔ میں تو انڈا کھاؤں گا۔"

امّی نے ہار مانتے ہوئے کہا "چلو، آؤ۔ میں تمہیں انڈا بنا کر دیتی ہوں۔"

نعمان کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ شام کو اس کی آنکھ کھلی تو وہ گراؤنڈ میں دوستوں کے ساتھ کھیلنے نکل گیا۔ راستے میں ایک جگہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ہر قسم کی غلاظت وہاں پڑی ہوئی تھی۔ نعمان نے ناک سکیڑتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا لیکن ایک چیز دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کوڑے کے ڈھیر پر دو بچے بیٹھے کچھ ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ پھر اچانک وہ کچھ کھانے لگے۔ نعمان نے دیکھا کہ وہ گلے سڑے پھل اٹھا کر کھا رہے ہیں جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اسی وقت نعمان کے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ اذان سُن کر وہ بے اختیار مسجد کی طرف چل پڑا اور سوچنے لگا کہ اللہ کا ہم پر کتنا احسان ہے کہ وہ ہمیں رزق عطا کرتا ہے اور ہم پھر بھی اس کی ناشکری کرتے ہیں۔ نماز کے بعد اس نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور گھر پہنچ کر امّی کو آواز دی "امی، کدو والا سالن پلیٹ میں ڈال دیں۔ میں وہی کھاؤں گا" اور امّی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔

(چھٹا انعام : 25 روپے کی کتابیں)۔

ہچکی

سامعہ محمود، گوجرانوالہ

آیئے، میں آپ کو ایک مزے دار واقعہ سناتی ہوں جو مجھے پیش آیا۔ ایک دفعہ مجھے ہچکیاں لگ گئیں۔ میں نے پانی پیا، پھر بھی ٹھیک نہ ہوئیں۔ میں نے کہا، خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر میں اپنے کمرے میں جانے لگی۔ راستے میں دادی جان کا کمرا پڑتا ہے۔ ادھر سے گزری تو دادی جان نے بُلالیا اور کہا "تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک دم ہچکی آ گئی۔ دادی جان سمجھ گئیں۔ انہوں نے کہا "اچھا تو میری بیٹی کو ہچکیاں آ رہی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ پانی پی لو۔ ختم ہو جائیں گی۔" میں نے کہا "پانی پیا تھا۔ ختم نہیں ہوئیں۔"

دادی جان کچھ سوچنے لگیں۔ پھر سنجیدگی سے بولیں "تمہارے بستر کے پاس جو الماری ہے، اس میں میرے پانچ سو روپے پڑے تھے۔ تمہارے سوا اور کوئی نہیں نکال سکتا۔ سیدھی طرح سے دے دو ورنہ تمہارے ابّو سے شکایت کروں گی۔"

"دادی جان، میں نے تو کبھی کوئی چیز چوری نہیں کی" میں نے رونی شکل بنا کر کہا۔ یہ سن کر دادی جان مسکرانے لگیں۔ بولیں "دیکھا، ہچکیاں بند ہو گئیں۔"

میں حیرت اور خوشی سے ان کو دیکھنے لگی۔

جب مجھے تین چار منٹ تک ہچکی نہیں آئی تو انہوں نے کہا "میری بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ وہ کبھی کوئی چیز چوری نہیں کرتی۔ اگر کسی کی چیز لینی ہو تو اس کی اجازت سے لیتی ہے۔ میں نے تو یہ ڈراما تمہاری ہچکیاں بند کرانے کے لئے کیا تھا۔"

اب میں سب کی ہچکیاں اسی طریقے سے بند کراتی ہوں۔ آپ بھی آزما دیکھیں۔ آزمایا ہوا نسخہ ہے۔

(ساتواں انعام : 20 روپے کی کتابیں)۔

اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیے

ماہنامہ تعلیم و تربیت

32- شارع بن بادیس- لاہور

Sharjeel Ahmed

بارہ مہینے

تاج انصاری

جنوری، فروری سرد ہوائیں خُشک پڑی ہے سردی
کھانسی اور زُکام نے اپنی حالت پتلی کر دی

مارچ اور اپریل مہینے، ساتھ بہاریں لائے
دیکھ کے رنگ برنگے پھول، سبھی کا جی للچائے

مئی اور جون کے آئے ہیں یہ گرمی بھرے مہینے
سکول سے گھر تک آتے آتے چُھٹنے لگے پسینے

جولائی، اگست میں بادل ایسے جھوم کے برسے
بچّے سارے نکلے نہانے، اپنے اپنے گھر سے

سِتمبر اور اکتوبر میں ہے پت جھڑ کا نظّارہ
کھیلیں کُودیں ایسے میں نہ، ہم کو نہیں گوارا

نومبر اور دسمبر میں سردی نے کیا بِنڈھال
سچّی بات تو یہ ہے بچّو، بیت گیا ہے سال

ہونہار مصوّر

تصویر کا سائز: 6×9

گدھا گاڑی

عنبرین سلطان، راولپنڈی (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

عنبرین شاہد، کراچی (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

سعد نعمان، اسلام آباد (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

محمد ابراہیم شیخ، حب چوکی (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

شیراز عارف علی، گوجرانوالہ (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

فیاض احمد، ضلع بہاولنگر (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:

ثروت طاہر، لاہور۔ سیّد عبدالسلام، ربوہ۔ سہیل اصغر، موہری شریف۔ محمد فیاض عزیز درانی، سہائے والا۔ فدا محمد خان، بنوں کینٹ۔ حامد رضا، جہلم۔ نوشین اشرف، اچھرہ لاہور۔ نوید بخش قادری، اسلام آباد۔ جاوید اقبال ثاقب، شیر گڑھ۔ صباحت نورین، بہاولپور۔ محمد آصف، سرگودھا۔ فرحانہ خلیل، کراچی۔ عامر شہزاد، موہری شریف۔ عثمان صبور صادق، اعوان ٹاؤن لاہور۔ زاہد اصغر علی بھٹی، ڈیرہ غازی خان۔ محمد حسیب احمد، میرپور آزاد کشمیر۔ شاہد محمد خان، بنوں کینٹ۔ پرویز اقبال جاس، میانوالی۔ فریحہ عابد، فیصل آباد۔ بلال مسعود قریشی، راولپنڈی۔ عمران سہیل بوبی، اوکاڑا۔ طارق محمود، مورگاہ۔ عطاء اللہ صادق، لاہور۔ مہوش سکندر، راولپنڈی۔ محمد امیر مرزا، کراچی۔

(نوٹ) گذشتہ ماہ راولپنڈی سے شاہد احمد کی تصویر دوسری جماعت کی اردو کی کتاب سے نقل شدہ تھی۔ اس لئے ان کو انعام کی کتابیں نہیں بھیجی جائیں گی اور انہیں بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔

آخری تاریخ 10 دسمبر | جنوری: موچی | فروری: مالی

آپ ان موضوعات میں سے جس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں۔

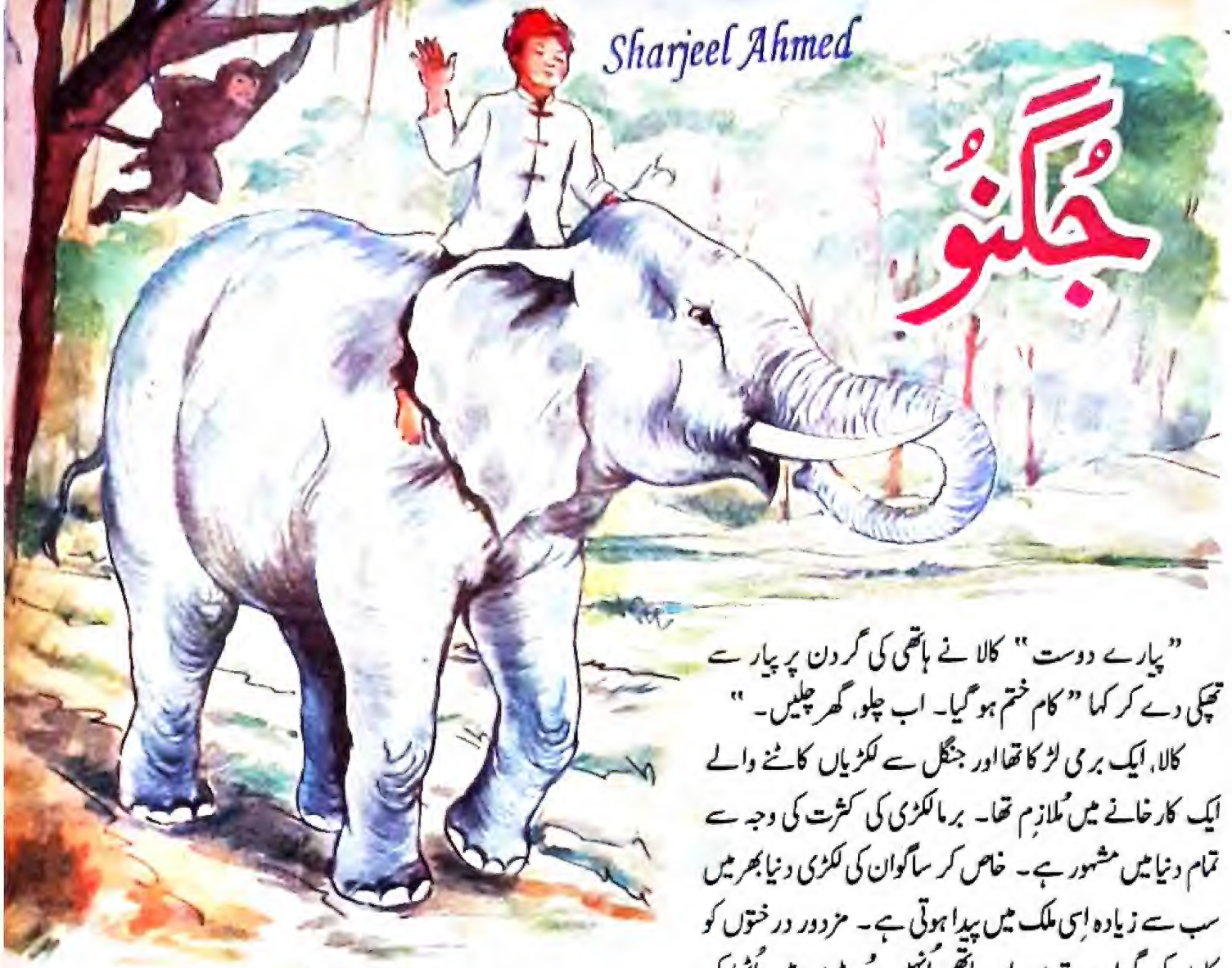

Sharjeel Ahmed

جگنو

"پیارے دوست" کالا نے ہاتھی کی گردن پر پیار سے تھپکی دے کر کہا "کام ختم ہو گیا۔ اب چلو، گھر چلیں۔"

کالا، ایک برمی لڑکا تھا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹنے والے ایک کارخانے میں مُلازم تھا۔ برما لکڑی کی کثرت کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ خاص کر ساگوان کی لکڑی دنیا بھر میں سب سے زیادہ اِسی ملک میں پیدا ہوتی ہے۔ مزدور درختوں کو کاٹ کر گرا دیتے ہیں اور ہاتھی اُنہیں سُونڈوں میں اُٹھا کر قریب کے دریا میں پھینک دیتے ہیں۔ درختوں کے کٹے ہوئے تنے دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے لکڑی چیرنے کے کارخانوں تک جاتے ہیں، جہاں دریا کے آر پار موٹے موٹے رسّے بندھے ہوتے ہیں۔ اِن رسّوں میں یہ تنے پھنس جاتے ہیں اور کارخانے والے اِنہیں نکال لیتے ہیں۔

ہر کارخانے دار کے پاس چند ہاتھی ہوتے ہیں اور وہ اُن کے لیے مہاوت بھی ملازم رکھتا ہے۔ کالا کا باپ ایک بہُت ہوشیار اور محنتی مہاوت تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد کارخانے دار نے کالا کو مُلازم رکھ لیا۔ کالا کی ماں بچپن ہی میں مر چکی تھی اور اب دنیا میں اُس کے صرف دو ہی دوست تھے، ایک اُس کا ہاتھی جگنو اور دُوسرا چھوٹو بندر جو اپنی دلچسپ حرکتوں سے اُس کا دل بہلاتا رہتا۔

شام کا دُھندلکا چھانے لگا تھا۔ دوسرے ہاتھی بان اپنے ہاتھی لے کر گھر چلے گئے تھے۔ کالا نے پیار سے جگنو کی گردن تھپ تھپائی اور بولا "چلو بھئی جگنو، اب چل کر آرام کریں۔" اور جگنو ایک فرماں بردار نوکر کی طرح ٹھمک ٹھمک کر گھر کی طرف چلنے لگا۔ اُن کے ساتھ چھوٹو بھی درختوں پر اُچھلتا کُودتا، خُوں خُوں کرتا چل رہا تھا۔

جنگل کے سِرے پر فیل خانہ تھا، جہاں تمام ہاتھی جمع ہوتے تھے، اور فیل خانے سے ذرا پرے کارخانے کے مالک کا بنگلا تھا۔ جب تینوں دوست فیل خانے کے قریب پہنچے تو بنگلے سے ڈزن ڈزن گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں اور دو سائے اندر سے نکل کر شام کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ کالا جلدی سے نیچے اُترا اور بھاگتا ہوا بنگلے کے اندر گیا۔ بنگلے کے دروازے کے ساتھ ہی کارخانے کا دفتر تھا۔ دفتر کا دروازہ چوپٹ کُھلا ہُوا تھا اور اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ کالا

نے اندر گھس کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے کی دیوار کے پاس ایک آدمی رسّیوں سے بندھا پڑا تھا۔ یہ کارخانے کا مالک مسٹر مان فون تھا۔ کالا نے جلدی جلدی اُس کی رسّیاں کھولیں اور چیخ کر بولا "جناب! خیر تو ہے؟ یہ ـــ یہ گولیاں کس نے چلائی تھیں اور ....."

مان فون کراہتا ہوا بولا "افسوس! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ سب کچھ لُوٹ کر لے گئے۔ سب کچھ ـــ"

"کون ـــ؟ کون لے گئے؟" کالا نے بے تابی سے پوچھا۔

فون چند منٹ سانس لینے کے لیے رُکا اور پھر بولا "میں دفتر میں بیٹھا حساب کتاب کر رہا تھا کہ دو آدمی بندوقیں لیے اندر داخل ہوئے اور مجھ سے تجوری کی چابیاں مانگیں۔ میرے اِنکار کرنے پر اُنھوں نے گولیاں مار مار کر تجوری کا تالا توڑ دیا اور مجھے رسّیوں سے جکڑ کر نیچے پھینک گئے اور "

"اور کیا ـــ؟" کالا نے جلدی سے پوچھا۔

"اور وہ تمام روپیہ بھی لے گئے جو کل میں بینک سے مزدوروں کو تنخواہیں دینے کے لیے لایا تھا ـــ اب کیا ہو گا؟ پہلے ہی مجھے کافی نقصان ہو چکا ہے۔ اب میں زیادہ نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ہاتھی فروخت کرنا پڑے گا" یہ کہہ کر وہ کراہتا ہوا اُٹھا اور بولا "میں شہر جا رہا ہوں، تھانے میں رپٹ کرنے۔ تم صبح کو چن من کے کارخانے میں جا کر اُس کے مالک سے بات چیت کرو۔ اگر وہ جگنو کو مول لینے پر تیار ہو تو مجھے آ کر بتانا۔"

کالا یہ سُن کر اُچھل پڑا جیسے اُس کی پیٹھ میں کسی نے چُھرا بھونک دیا ہو۔ جگنو تو اُس کی زندگی کا ساتھی ہے۔ وہ بھی اُس سے جُدا ہو گیا تو پھر دنیا میں اُس کا کون رہ جائے گا!

وہ ہکّا بکّا کھڑا کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا کہ یکایک چونک پڑا۔ چمّو خوں خوں کرتا ہُوا اُس کے کاندھے پر چڑھ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گتّے کا ایک گول سا ٹکڑا تھا۔ کالا نے وہ ٹکڑا اس سے چھین لیا اور اُسے غور سے دیکھا تو حیرت سے اُچھل پڑا۔ گتّے کے ٹکڑے پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "چن من کمپنی۔" کالا نے چیخ کر کہا "ارے! یہ تو کسی مزدور کا شناختی کارڈ ہے۔ یہ یہاں کیسے آیا؟ آہ! میرے خدا! یہ چن من کمپنی کے کسی مزدور کی شرارت تو نہیں! ابھی چل کر کھوج لگاتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد تینوں دوست گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ اِس جنگل سے پرے دوسرا جنگل تھا اور اس کے کنارے چن من کمپنی کے مزدوروں کی بستی تھی۔ جگنو چُپ چاپ چلا جا رہا تھا کہ ایک دم چلتے چلتے رُک گیا اور سُونڈ اٹھا کر کچھ سُونگھنے لگا۔ کالا تھوڑا سا آگے کو جُھکا اور آہستہ سے بولا "کیا ہے جگنو؟ کیا سونگھ رہے ہو؟" جگنو نے سونڈ اِدھر اُدھر گھُمائی اور پھر کچھ سونگھنے لگا۔

"دھت دھت دھت" کالا نے اُس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر کہا۔ جگنو نے اپنی سُونڈ اونچی کر دی اور کالا اُس کی سونڈ کے ذریعے نیچے اُتر آیا۔ اُس جگہ ڈھلان تھی۔ اور جب وہ آگے بڑھا تو اُس کے پیروں کو نمی محسوس ہوئی اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ آگے ایک دل دل تھی اور اس خوفناک دل دل میں ایک آدمی پھنسا ہوا باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے کالا کو دیکھا تو چلّا کر بولا "بھائی! میں مر رہا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ!" مگر کالا اُسے کیسے بچاتا۔ اندر جاتا تو خود بھی پھنس جاتا۔ رسّی بھی پاس نہیں تھی۔

چمّو موقع پا کر ایک درخت پر چڑھ گیا تھا اور اُس کی ڈاڑھیاں پکڑ کر اِدھر اُدھر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ اچانک کالا کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے جگنو کو آواز دی اور اُس کے اوپر چڑھ کر درخت کی دو تین لمبی لمبی ڈاڑھیاں کاٹ لیں۔ پھر نیچے اُتر کر انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ لیا۔ یہ ایک لمبی سی مضبوط رسّی بن گئی۔ اِس رسّی کا ایک سِرا اُس نے جگنو کے دانت سے باندھا اور دوسرا سِرا دلدل میں پھنسے ہوئے آدمی کی طرف پھینک دیا۔ اُس نے فوراً ہی وہ سرا اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔

"کھینچو جگنو! کھینچو!" کالا نے زور سے کہا اور جگنو نے دو منٹ میں اُس آدمی کو دلدل سے باہر کھینچ لیا۔

"میرے مُحسن! میرے بھائی!" اُس آدمی نے کالا کو خوشی سے لپٹاتے ہوئے کہا "تم نے مجھے موت کے بھیانک جبڑوں سے نکالا ہے۔ میں تمہارا کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں۔"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو اور اس دلدل میں کیسے پھنسے؟" کالا نے پوچھا۔

"میرا نام جوکو ہے" اُس آدمی نے جواب دیا "اور میں چن من کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ اِدھر سے گزر رہا تھا کہ اِس دلدل میں پھنس گیا۔" یہ کہہ کر اُس نے دم لیا اور بولا "تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں کام کرتے ہو؟"

کالا نے اُسے ساری باتیں بتائیں اور بولا "مجھے یقین ہے کہ چور تمہاری ہی بستی کا کوئی آدمی ہے۔ میرے پاس اِس کا ثبوت موجود ہے۔"

یہ سُن کر جوکو کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ مگر فوراً ہی اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور دانت نکوس کر بولا "اگر چور میری بستی کا آدمی ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کو پکڑوانے میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم کل شام مجھ سے ملو۔"

"کہاں ــــ؟" کالا نے خوش ہو کر پوچھا۔

جوکو نے تھوڑی دیر کچھ سوچا اور پھر بولا "اُس جنگل سے پرے، جہاں سے ہماری بستی شروع ہوتی ہے۔ اُس کے کنارے پر ساگوان کا ایک بہت اونچا درخت ہے۔ کل تم دن چُھپتے ہی وہاں پہنچ جانا۔"

دوسرے دن شام کو کالا اُس ساگوان کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اُس نے جگنو کو کچھ دور ایک دوسرے درخت کے نیچے کھڑا کر دیا تھا تاکہ اُسے کوئی دیکھ نہ لے۔ چمّو بھی جگنو کے ساتھ تھا۔ سورج ڈوبے کافی دیر ہو گئی تھی مگر جوکو ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک دم پیچھے سے کسی نے اُسے دبوچ لیا۔ یہ جوکو تھا! اُس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اُس نے کالا کی طرف بندوق چھتیائی مگر جوکو نے اُسے روک دیا اور بولا "یہاں نہیں۔ بندوق کی آواز سُن کر لوگ آ جائیں گے۔ جنگل میں لے چلو۔"

دونوں کالا کو گھسیٹتے ہوئے جنگل کی طرف لے چلے۔ جنگل میں سے گزرتے ہوئے کالا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جانور درختوں پر چھلانگیں لگاتا ہُوا اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

بچّوں بیچ جنگل میں پہنچ کر جوکو اور اس کا ساتھی ٹھہر گئے۔

جوکو بولا "بس، یہ جگہ ٹھیک ہے۔ سوکو! نشانہ لگاؤ۔" اور سوکو نے بندوق اٹھا کر کاندھے سے لگالی مگر لب لبی دبانے والا ہی تھا کہ درخت کے اُوپر سے کوئی جانور دھم سے اُس کے اُوپر کُودا۔ یہ چمّو تھا۔ اِس ناگہانی آفت سے سوکو کے ہاتھ ہل گئے اور گولی کالا کے لگنے کی بجائے جوکو کا کندھا چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ اب ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ کالا سوکو کو دھکّا دے کر وہاں سے بھاگا اور اُس جگہ پہنچا جہاں جگنو کھڑا اُس کا اِنتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چمّو بھی آ گیا اور تینوں دوست دوسرے راستے سے گھر کی طرف چلے۔ اب یہ بات بِالکل صاف تھی کہ جوکو ہی چور تھا۔ کالا سوچ رہا تھا کہ وہ گھر جا کر مالک کو سارا قصّہ بتائے گا اور پھر اُسے ساتھ لا کر اِن چوروں کو پکڑوا دے گا۔ لیکن ایکا ایکی اُس کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جوکو اُس دلدل کے پاس چوری کا روپیہ چُھپا رہا ہو اور بے خبری میں دلدل میں پھنس گیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے جگنو کا رُخ دلدل کی طرف موڑ دیا۔

چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں چاند کی روشنی درختوں کی شاخوں سے چھَن چھَن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔ ابھی وہ دلدل سے کچھ فاصلے پر تھے کہ جگنو ایک دم چلتے چلتے ٹھہر گیا اور سُونڈ اُٹھا کر کچھ سُونگھنے لگا۔ یہ دیکھ کر کالا چُپ چاپ دم سادھ کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یکایک دل دل کی طرف سے دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ یہ جوکو اور اُس کا ساتھی سوکو تھا۔ جوکو کے کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ کالا نے جگنو کو پگڈنڈی سے ہٹا کر ایک طرف کھڑا کر دیا تاکہ وہ اُسے دیکھ نہ سکیں اور جب وہ اُس کے قریب سے گزرے تو اُس نے ایک دم جوکو پر چھلانگ لگا دی۔ سوکو اُسے چھُڑانے کے لیے لپکا تو جگنو نے اُسے سُونڈ میں جکڑ کر اِتنی زور سے پٹخا کہ ہڈّی پسلی ایک ہو گئی۔ اب وہ جوکو کی طرف بڑھا اور اُسے بھی سونڈ میں جکڑ کر درخت کی جڑ سے دے مارا۔ دونوں چور بے ہوش ہو کر لمبے لمبے لیٹ گئے۔

کالا روپے کا تھیلا اٹھا کر بھاگم بھاگ گھر گیا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو بُلا لایا۔ جوکو اور سوکو ابھی تک بے ہوش پڑے تھے۔ سب نے مِل کر اُن کی مُشکیں کسیں اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ مان فون کالا کے اِس کارنامے سے اِتنا خوش ہُوا کہ اُسے تمام مہاوتوں کا جمع دار بنا دیا اور دو سو روپے نقد اِنعام بھی دیا۔

کالا نے پیار سے جگنو کی سُونڈ سہلائی اور بولا "پیارے دوست! یہ سب تمہاری مہربانی کا نتیجہ ہے۔" چمّو خُوں خُوں کر کے اُس کے کاندھے پر آ چڑھا جیسے کہہ رہا ہو "اور میری نہیں؟" کالا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنس کر بولا "اور تمہاری بھی ــــ" (س ۔ ل)

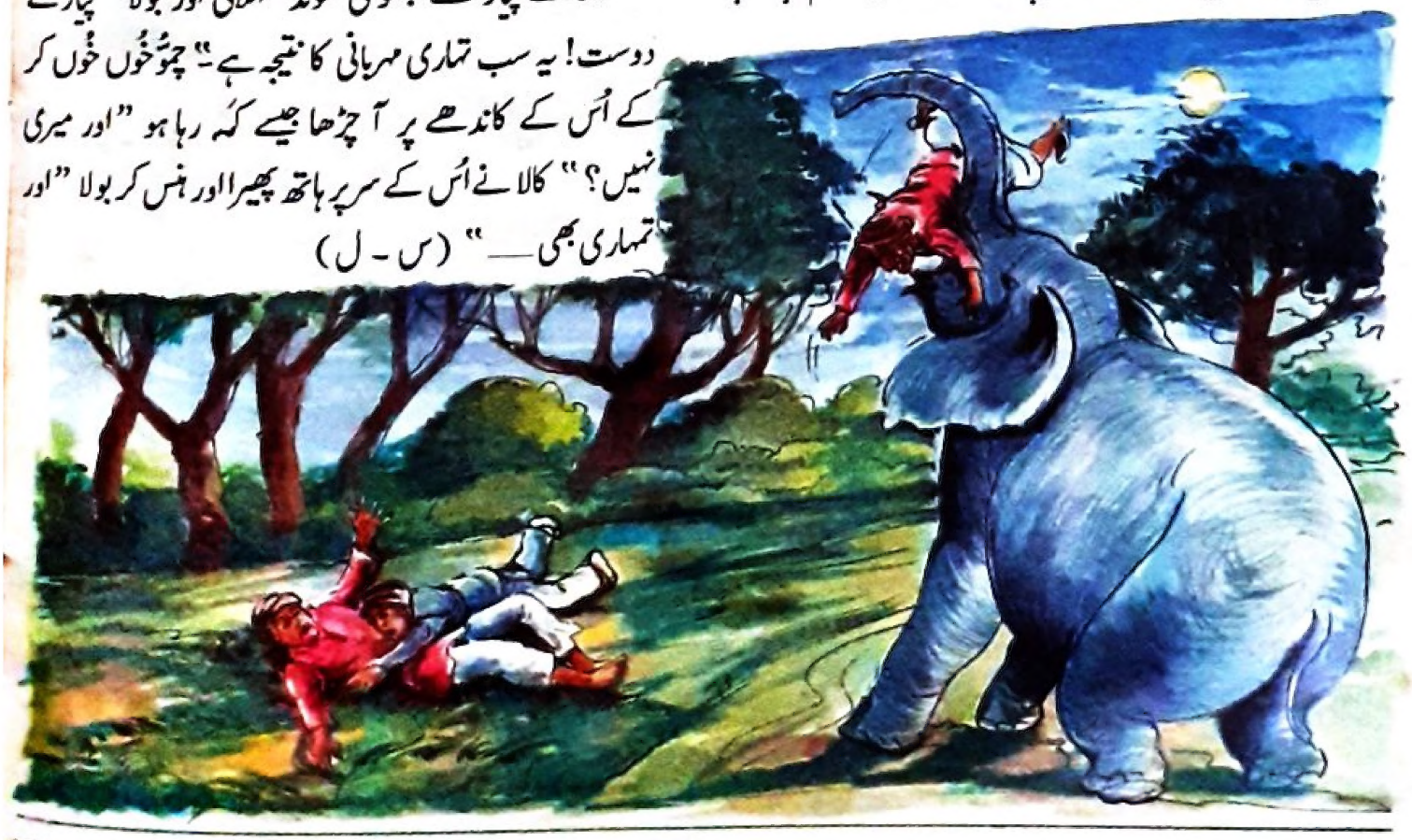

کالا ناگ ہاتھی کو بھی ہلاک کر سکتا ہے

کالا ناگ جنوب مشرقی ایشیا میں پائے جانے والے تمام سانپوں سے زیادہ زہریلا اور خطرناک سانپ ہے۔ اِس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ یہ 18 فٹ تک لمبا ہوتا ہے اور اِس کی زہر کی تھیلیاں بھی بہت بڑی ہوتی ہیں۔ بہت غصیلا اور غضب ناک سانپ ہے۔ خطرے کی بُو سونگھتے ہی بھڑک اُٹھتا ہے اور دشمن پر اِس پُھرتی سے حملہ کرتا ہے کہ اُسے سنبھلنے تک کا موقع نہیں ملتا۔

جوان ناگ پانچ فٹ اُونچا کھڑا ہوجاتا ہے اور اس وقت پھَن پھیلا کر، جھوم جھوم کر، پھُنکارتا ہے تو بڑے بڑے بہادروں کا پِتّا پانی ہوجاتا ہے۔ جنگل کے تمام جانور اِس سے ڈرتے ہیں، حتیٰ کہ ہاتھی بھی اِسے دیکھتے ہی بھاگ اُٹھتا ہے۔ ہاتھی کی سونڈ کے اندر اور ناخنوں کے درمیان کی کھال بہت پتلی اور نرم ہوتی ہے۔ ناگ اِن جگہوں پر ڈَس لے تو ہاتھی چند منٹ میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔

عظیم مسلمان

البیرونی (973—1048)

عین الحق فریدی کوٹی

Shajeel Ahmed

حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ "علم مومن کی میراث ہے جسے حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔" ہمارے بزرگوں نے اپنے قول اور فعل سے اس ارشاد کو سچ کر دکھایا۔ البیرونی بھی ان بزرگان دین میں سے ایک تھے کہ جنہوں نے اپنی تمام زندگی علم حاصل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں صرف کر دی۔

وہ آج سے ایک ہزار برس پہلے 973ء میں ترکستان کے صوبے خوارزم کے دارالخلافہ "کاث" میں ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام برہان الحق ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ترکستان خانہ جنگیوں کی لپیٹ میں تھا۔ ان حالات میں البیرونی کی ابتدائی زندگی مسلسل ہنگاموں میں گزری جس میں اسے کئی دفعہ قید و بند کی مصیبتیں بھی اٹھانا پڑیں۔ پھر بھی اس نے تحصیل علم کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ شروع سے ہی غور و فکر کا عادی تھا اور ہمیشہ کائنات کے رازوں کے جاننے کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اسے قدیم اہل دانش کے خیالات کا پتہ لگانے کے لئے کئی ایک زبانوں مثلاً عربی، فارسی، یونانی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت وغیرہ کا مطالعہ کرنا پڑا۔ اس نے 24 سال کی عمر میں اپنی سب سے پہلی کتاب ستاروں کے علم کے بارے میں لکھی۔

اس نے نیوٹن سے ساڑھے سات سو سال قبل زمین کی کشش ثقل کے بارے میں بحث کی، زمین کا اپنے محور کے گرد گردش کرنے کا ذکر کیا، زمین کا قطر ماپنے کا فارمولا پیش کیا، روشنی اور آواز کی باہمی رفتار کا جائزہ لیا، حساب اور جیومیٹری کے کئی ایک پیچیدہ مسائل کا حل پیش کیا بلکہ زاویئے کی پیمائش کے بارے میں ایک مسئلہ خود البیرونی کے اپنے نام سے مشہور ہے جسے مغرب میں "البیرونائی مسئلہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک انسان نے اس عہد میں کہ جسے اہل یورپ تاریک دور کے نام سے یاد کرتے ہیں اتنے پیچیدہ مسائل کے بارے میں سیر حاصل بحث کی۔

البیرونی کی تصنیفات کی کل تعداد ایک سو اسی سے کچھ اوپر تسلیم کی جاتی ہے اور یہ تمام کی تمام خالصتاً سائنسی اور تحقیقی علوم پر مشتمل ہیں۔

اس کی سب سے مشہور تصنیف "کتاب الہند" ہے کہ جس میں اس عہد کے ہندوستان کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس نے 75 سال کی عمر میں غزنی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوا۔

مشہور مسلمان مورخ "یاقوت" نے البیرونی کے بارے میں لکھا ہے کہ: "اس کا ہاتھ قلم سے، آنکھیں مطالعہ سے اور ذہن غور و فکر سے کبھی خالی نہ رہا۔"

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R. L. No. 4756
ISSN 969 0039 9175
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES
Price Rs. 9.00

گفٹ بکس

خوشی کے موقع پر اپنے عزیزوں اور
دوستوں کو یہ خوبصورت اور
رنگین کتابیں تحفے میں دیجیے

اور دوسری کہانیاں

ہدایات برائے آرڈرز :

سندھ اور بلوچستان پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ۔ کراچی فون : 570527
570534-537730

پنجاب 60 شاہراہ قائدِ اعظمؒ۔ لاہور 301196-98

صوبہ سرحد، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے 277 پشاور روڈ۔ راولپنڈی 63503-64273

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور ۔ راولپنڈی ۔ کراچی